ماہنامہ

جولائی 2026ء

طلوعِ اسلام

لاہور

اشاعت کا بیاسی واں سال

قرآنی نظامِ
ربوبیت کا
پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

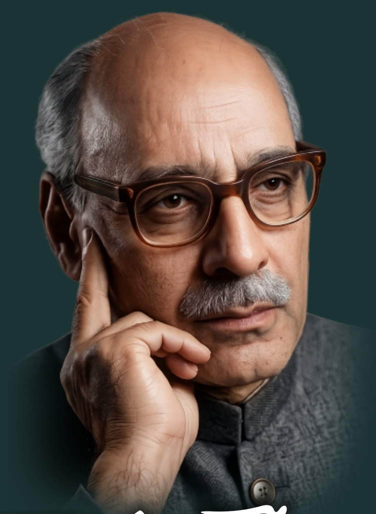

پرویزؒ

09 جولائی 1903ء
24 فروری 1985ء

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویزؒ۔ معراجِ انسانیت)

ایران اور امریکہ ممکنہ معاہدہ

درسِ قرآن

مکتوب پرویزؒ

اتحادِ انسانیت اور اُمتِ واحدہ

نئی بت پرستی

غیر مسلموں کے نیک کاموں کے ثواب کا مسئلہ

دنیا میں امن ضرور قائم ہوگا

ایک تصویر دیکھ کر

9 جولائی: ایک شخصیت نہیں، ایک سوال

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

قرآن کی حکومت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (3:19)-

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور
جولائی 2026ء
جلد 79 | شمارہ نمبر 07

اس شمارے میں

صفحہ نمبر	مصنف	عنوان
4	محمد سلیم اختر	لمعات: ایران اور امریکہ ممکنہ معاہدہ
6	پرویز علیہ الرحمہ	درسِ قرآن
27	ادارہ	مکتوب پرویزؒ
30	خورشید انور (چیئرمین ادارہ)	اتحادِ انسانیت اور اُمتِ واحدہ
33	زیڈ نصیر	نئی بت پرستی
41	ادارہ	غیر مسلموں کے نیک کاموں کے ثواب کا مسئلہ
45	شاہنواز خان ایڈووکیٹ	دنیا میں امن ضرور قائم ہوگا
46	خالد گل، سعودی عرب	ایک تصویر دیکھ کر
47	انجینئر سلیم اقبال، منگورہ سوات	9 جولائی: ایک شخصیت نہیں، ایک سوال
51	ادارہ	بچوں کا صفحہ: اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے
53	حکیم محمد سعید (مرحوم)	قرآن کی حکومت

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 100 روپے فی پرچہ
پاکستان: 1200 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1500 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور   اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

محمد سلیم اختر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ایران امریکہ ممکنہ معاہدہ

ایران اور امریکہ کے درمیان اگر کسی پائیدار اور متوازن معاہدے کی راہ ہموار ہوتی ہے اور پاکستان اس عمل میں مؤثر ثالث یا سہولت کار کے طور پر سامنے آتا ہے تو یہ پیش رفت محض ایک سفارتی کامیابی نہیں بلکہ ایک وسیع تر اقتصادی تبدیلی کا نقطۂ آغاز بن سکتی ہے۔ بین الاقوامی نظام میں وہی ریاستیں حقیقی اثر ورسوخ حاصل کرتی ہیں جو تنازعات کو کم کرنے، اعتماد سازی کو فروغ دینے اور مختلف طاقتوں کے درمیان رابطے کا پل بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ پاکستان اگر اپنی جغرافیائی اہمیت، تاریخی روابط اور خطے میں اپنی اسٹریٹجک پوزیشن کو دانشمندانہ انداز میں استعمال کرے تو نہ صرف اس کی سفارتی ساکھ میں اضافہ ہوگا بلکہ عالمی سطح پر اس کی معاشی افادیت بھی زیادہ نمایاں ہوسکتی ہے۔

> یہ امن معاہدہ پاکستان کی توانائی کے لیے ایک بنیادی ستون ثابت ہوسکتا ہے۔توانائی کی مستحکم اور نسبتاً کم لاگت فراہمی صنعتی ترقی، زرعی پیداوار اور روزگار کے وسیع مواقع پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس تناظر میں سب سے نمایاں معاشی امکان ایران کے ساتھ توانائی کے تعاون کا فروغ ہے۔ برسوں سے تعطل کا شکار ایران پاکستان گیس پائپ لائن منصوبہ اگر عملی پیش رفت کی طرف بڑھتا ہے تو یہ پاکستان کی توانائی کے لیے ایک بنیادی ستون ثابت ہوسکتا ہے۔توانائی کی مستحکم اور نسبتاً کم لاگت فراہمی صنعتی ترقی، زرعی پیداوار اور روزگار کے وسیع مواقع پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اسی طرح ایران کے ذریعے وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کی منڈیوں تک رسائی پاکستان کے لیے برآمدات میں تنوع اور تجارت میں وسعت کے نئے دروازے کھول سکتی ہے، جو ایک کمزور برآمدی ڈھانچے کے لیے نہایت اہم پیش رفت ہوگی۔

تاہم اس پورے منظرنامے کی کامیابی کا انحصار محض بیرونی مواقع پر نہیں بلکہ داخلی استحکام پر ہے۔ قرآن مجید کا ایک

بنیادی اصول یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی حالت میں تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔ یہ اصول محض روحانی یا اخلاقی سطح تک محدود نہیں بلکہ سماجی، معاشی اور ریاستی ڈھانچوں پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے۔ جب تک کسی معاشرے میں مالی نظم و ضبط، ادارہ جاتی شفافیت، پالیسیوں کا تسلسل اور قانون کی بالادستی قائم نہ ہو، بیرونی مواقع اپنی مکمل استعداد کے ساتھ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔

قرآنی فکر کے مطابق کسی بھی قوم کی قوت کا حقیقی سرچشمہ اس کے اخلاقی و ادارہ جاتی نظم میں پوشیدہ ہوتا ہے، نہ کہ محض وسائل یا جغرافیہ میں۔ عدل، امانت، مشاورت اور ذمہ دارانہ حکمرانی وہ بنیادی اصول ہیں جو اجتماعی ترقی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

پاکستان کے موجودہ حالات میں اصل چیلنج بیرونی تعلقات سے زیادہ داخلی اصلاح ہے۔ بدعنوانی، انتظامی کمزوری، معاشی عدم توازن اور سیاسی عدم استحکام وہ عوامل ہیں جو کسی بھی بڑی پیش رفت کے ثمرات کو محدود کر دیتے ہیں۔ سرمایہ کاری اور بین الاقوامی شراکت داری ہمیشہ وہاں فروغ پاتی ہے جہاں اعتماد، استحکام اور پیش بینی کی صلاحیت موجود ہو۔ تجارتی راہداریوں اور توانائی منصوبوں کی کامیابی بھی اسی وقت ممکن ہے جب ریاستی ادارے مؤثر، خودمختار اور جوابدہ ہوں۔

قرآنی فکر کے مطابق کسی بھی قوم کی قوت کا حقیقی سرچشمہ اس کے اخلاقی اقدار و ادارہ جاتی نظم میں پوشیدہ ہوتا ہے، نہ کہ محض وسائل یا جغرافیہ میں۔ عدل، امانت، مشاورت اور ذمہ دارانہ حکمرانی وہ بنیادی اقدار ہیں جو اجتماعی ترقی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اگر پاکستان ان اصولوں کو اپنی ریاستی ترجیحات کا حصہ بنائے تو وہ نہ صرف خطے میں ایک فعال کردار ادا کر سکتا ہے بلکہ ایران۔امریکہ جیسے ممکنہ مفاہمتی عمل سے بھی بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

لہٰذا دانشمندانہ حکمت عملی یہی ہے کہ پاکستان ایک طرف خطے میں امن، سفارت اور اقتصادی تعاون کی ہر کوشش میں تعمیری کردار ادا کرے اور دوسری طرف اپنی داخلی اصلاحات کو اولین ترجیح دے۔ یہی توازن پاکستان کو ایک ردِعملی ریاست سے ایک فعال، باوقار اور مؤثر علاقائی قوت میں تبدیل کر سکتا ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جو قرآنی اصولِ تدریج کی رُو سے مکمل قرآنی نظام کے قیام سے قبل کے عبوری دور میں اصلاحِ احوال، ریاستی استحکام اور پائیدار ترقی کے حقیقی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

❀❀❀❀❀

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الرعد آیات 3 تا 6

درسِ قرآن

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ۖ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ
اثْنَيْنِ ۖ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٣﴾ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ
وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا
عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٤﴾ وَإِن تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا
تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ ۖ
وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٥﴾ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ
مِن قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ
الْعِقَابِ ﴿٦﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1974ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الرعد کی یوں کہیے تیسری آیت سے ہوگا۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پچھلے درس میں اسی سورت کی دوسری آیت زیرِ نظر تھی لیکن اس کا آخری حصہ وہ میں نے اس درس پر ملتوی کر دیا تھا کہ اس میں بات ایک اہم آ رہی تھی اور وقت اُس درس میں باقی نہیں رہا تھا۔

سماء اور ارض کا لغوی مفہوم:

دوسری آیت میں آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کی تلقین کی ہے۔ میں دہرا دوں جو اس نے کہا ہے کہ ان آسمانی فضاؤں کے اندر آپ دیکھ رہے ہیں۔ یاد رکھئے! جسے قرآن سما یا سماوات کہتا ہے وہ ہمارے تصور میں یہ نیلگوں فضا جو نظر آتی ہے یہ مراد نہیں ہوتی۔ اس کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہے یہ تو صرف ہماری حدِ نگاہ ہے بلکہ وہ جو فضائی کرے یا جتنی بھی اجرامِ فلکی ہیں جو کچھ بھی اس فضا کی پہنائیوں میں بلندیوں میں (سما بلندی کو کہتے ہیں) جو کچھ بھی ہے اس سب کو قرآن سما کہہ کر پکارتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ارض کہتا ہے ارض کے معنی ہوتے ہیں جو چیز نیچے واقع ہو۔ اور سما ہوتی ہے جو اوپر واقع ہو۔ اور قرآن کا اعجاز ہے اور کون کون سا اعجاز نہیں ہے میں کہتا ہوں یہ چیزیں ہیں جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کا تو کوئی فلاسفر اور کوئی حکیم اور سائنٹسٹ بھی یہ باتیں نہیں جانتا تھا کہہ نہیں سکتا تھا

حالانکہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اس کا منتہا مقصود اور ہے۔ ضمناً جو بھی اس میں آ جاتی ہے وہ تو REALITY (حقیقت) کے خلاف ہو نہیں سکتی۔ سما اور یہ ارض کا لفظ جو ہے آپ دیکھئے کہ بظاہر ہم بھی آج اسی کو زمین کہتے ہیں یہ جو ہماری زمین ہے جسے ہم ارض کہتے ہیں کسی اور کو ہم ارض نہیں کہتے اور یہ جو ہیں آسمانی کرے اس کو ہم سما کہتے ہیں لیکن قرآنِ کریم ایک مقام پہ کہتا ہے کہ ہر سما کے مثل اس کی ارض ہے۔

صاحب! کتنی عظیم چیز ہے۔ یہ سما اور ارض جو ہے یہ RELATIVE TERMS ہیں یہ اضافی TERMS ہیں۔ جب کہیں گے کوئی چیز اونچی تو وہ کسی سے اونچی ہوگی' نیچے اس سے نیچے ہوگی۔ تو یہ جتنے بھی فضا کے اندر یہ فضائی کرے جنہیں آپ کہتے ہیں اب دیکھئے! کس انداز سے بات اس نے کہی کہ ہر اونچا اوپر کا کرہ جو ہے اس کی نسبت سے جو دوسرا نیچے ہے وہ اس کی ارض ہے۔ تو اس کی رو سے صرف ایک ارض نہیں ہے ہر بلند کرے کے مقابلے میں جو اس سے پست کرہ ہے نیچے سمجھ لیجے کرہ ہے اس کی ارض ہے ہر سما کے مثل اس کی ارض ہے۔ میں کہتا ہوں کبھی غور کیجئے اور کسی علم الافلاک کے ماہر سے کہیے کہ چودہ سو سال کا جتنا بھی فلکیات کا علم آپ کے سامنے ہے یہ چیز کہیں بھی آپ کو وہاں نظر آتی ہے کہ ہر سما کی ایک ارض ہے اور ہر ارض کی ایک سما ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آج بھی ارض جو ہے وہ ہم اسی زمین کو کہتے ہیں۔ قرآن نے چودہ سو سال پہلے یہ بات کہی ہے کہ ٹھیک ہے تمہاری زمین' تمہارے اوپر جو کرے ہیں ان کی نسبت سے نیچے واقع ہوئی ہے لیکن یہ ایک ہی ارض نہیں ہے ہر سما کی ایک ارض ہوتی ہے ہر ارض کا ایک سما ہوتا ہے۔ صاحب! اس قرآن کی کیا بات ہے!

وحی کے ذریعے کو محسوس دیکھنے کی خواہش پر قرآن حکیم کا جواب:

خیر! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ مظاہرِ فطرت کی طرف غور و تدبر کے لیے تلقین کر رہا ہے اور وہ کہہ یہ رہا ہے کہ تمہیں یہ بات ذہن میں نہیں آ رہی اس بات پہ تعجب آ رہا ہے کہ وحی ایک غیر محسوس ذریعۂ علم ہے محسوس طور پر تمہارے سامنے کیوں نہیں آتا۔ بار بار تم یہ کہتے ہو کہ ہم اس جبریل کو دیکھنا چاہتے ہیں اور فرشتے کو دیکھنا چاہتے ہیں معلوم کرنا چاہتے ہیں لکھی ہوئی کتاب ہونی چاہیے۔ دلیل یہ دی ہے کہ کیا یہ کلیہ ہے تمہارے سامنے کہ جو چیز تم آنکھوں سے نہ دیکھو اس کے متعلق کہو کہ وہ ہے ہی نہیں اور دلیل دی ہے باہر کی کہ تمہیں یہ شمس و قمر اور یہ کرے جو نظر آتے ہیں۔

یہ فضا کے اندر کہیں گڑے ہوئے ہیں' کوئی چیز ایسے فضا میں کھڑی ہو سکتی ہے کہ جس کے نیچے کوئی سہارا نہ ہو؟ ان کے نیچے کوئی سہارا تمہیں نظر آتا ہے؟ اور بغیر سہارے کے تو ہیں نہیں' یہ وہ سہارے ہیں جو تمہیں نظر نہیں آ سکتے لیکن سہارے ہیں۔ تو اگر محسوس کائنات کی یہ کیفیت ہے کہ اتنے اتنے بڑے سہارے تمہیں نہیں نظر آتے اس کے باوجود تم مانتے ہو کہ یہ کسی سہارے پہ ہی کھڑے ہیں بغیر سہارے کے اتنا بڑا کرہ جو ہے وہ کھڑا رہ سکتا ہے۔ ذرا سی اتنی سی کنکری تم فضا میں پھینکو بغیر سہارے کے کیسے نیچے آتی ہے اور یہ بغیر سہارے کے کھڑے ہیں بغیر سہارے کے نہیں ہیں سہارے ہیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ تو اگر محسوس دنیا میں بھی یہ کیفیت ہے کہ جو چیزیں نظر نہ آئیں ان کے متعلق یہ کلیہ نہیں ہے کہ وہ ہیں ہی نہیں' انہیں ماننا

پڑتا ہے۔تو یہ دنیا جسے وحی کی دنیا کہا جاتا ہے یہ تو عالمِ محسوس سے بھی دوسری چیز ہے۔

کیا یہ کائنات ایک معین مدت تک کے لئے ہے لفظ معین کا لغوی مفہوم اجل ہے

تو یہ ساری چیزیں پہلی آیت میں آئیں ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ‌ؕ كُلٌّ يَّجۡرِىۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى‌ؕ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ يُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ (13:2) کیا عجیب چیز ہے! شمس وقمر کی تسخیر ہے' پھر یہ چیز کہ یہ ابدی نہیں ہیں یہ ایک معین مدت کے لیے ہیں۔معین کا لفظ ہمارے ہاں ایسے نظر آتا ہے جیسے پہلے سے کسی چیز کے متعلق لکھ دیا گیا ہو' جو چیز قانون کے وارد ہونے والی ہو اس کو بھی یہ چیز اجل کہا جاتا ہے اس کے معنی اس معیاد کے ہیں۔گھڑی کو آپ چابی دیتے ہیں چوبیس گھنٹے جو ہیں یہ چوبیس گھنٹے اس کی اجل کہلاتی ہے۔

علامہ پرویز''قرآنِ حکیم کو پڑھانے والے مختلف شعبوں میں سپیشلسٹ ہونے چاہئیں'':

میں نے عرض کیا ہے کہ دراصل یہ نصاب کی کتاب ہے کلاس کے اندر پڑھانے کی کتاب ہے۔اور اس کے جتنے شعبے ہیں اس کو مختلف ماہرین پڑھائیں گے کسی ایک کے بس کی بات نہیں ہے' ایک ایک فن کے سپیشلسٹ ہونے چاہئیں جو اس کتاب کو پڑھائیں وہ تو ایک ایک لفظ ایسا ہے کہ آگے جا نہیں سکتا۔يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ (13:2) پھر جو چیز تمہیں محسوس نظر آتی ہے اس کے پیچھے پلاننگ کا زمانہ ایک ایسا ہوتا ہے

جسے تم دیکھ نہیں سکتے اور اصل چیز تو وہ چیز ہوتی ہے جس میں ان کی DIRECTION جو ہیں متعین کی جاتی ہیں۔ بہرحال یہ آیات جو ہیں ان کو ہم نکھار کر ابھار کر بیان کرتے ہیں۔اور بات جو میں نے چھوڑی تھی یہ کہ لَعَلَّكُمۡ کا ہے کے لیے یہ کچھ کرتے ہیں؟ میں نے کہا تھا کہ یہ لَعَلَّكُمۡ بڑی اہم چیز ہے''تا کہ یہ ہو''یعنی یہ سب کچھ پیچھے سے جو بیان کیا ہے وہ بیان کرنا مقصود بالذات نہیں ہے' یہ اس کے لیے جو آگے کہا جاتا ہے۔

مذہب کی دنیا میں تو عقل وفکر کا کوئی دخل ہی نہیں ہوتا:

میں نے کہا ہے کہ عام طور پہ مذہب کے معاملے میں وہ عقل کو اور REASON کو دخل نہیں ہے۔لَعَلَّكُمۡ (13:2) تو خاص REASON کی چیز ہے''تا کہ یہ ہو''۔''تا کہ'' ہی تو LOGIC کی بنیاد ہوتی ہے لیکن REASON یا LOGIC اس صورت میں بنتا ہے کہ وہ جو''تا کہ'' کا بعد کہا گیا ہے وہ واقعی جو پیچھے کہا گیا ہے وہ اس کا نتیجہ ہو۔اگر کوئی یہ چیز کہے کہ صاحب! تم پانی پیؤ تا کہ تمہارا دوست آجائے تو پوچھیں گے کہ صاحب! ان دو کڑیوں میں ربط کیا ہے۔اگر تم کہتے کہ صاحب! خط لکھو' تار دو' ٹیلیفون کرو تا کہ تمہارا بھائی آجائے' ان میں ربط ہے۔

Logic یا Reason کے فلسفے کی اہمیت اور اس کی وضاحت:

میں مثالوں سے یہ چیزیں واضح کرتا ہوں ورنہ یہ بھی ایک الگ علم ہے LOGIC ہے۔یہ کرو تا کہ یہ ہو جائے۔اب

یہاں لَعَلَّكُمْ آیا ہے ''تا کہ یہ ہوجائے'' تو نظر آتا ہے کہ جو کچھ پیچھے کہا گیا ہے وہ اس لیے ہے تا کہ یہ بات ہو وہ بات آگے کیا بتائی ہے؟ کارگہ کائنات کے اوپر غور وفکر کرو' دیکھو' سوچو تا کہ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (13:2) عام ترجمے آپ کو یہ ملیں گے ''تا کہ تمہیں اپنے رب کی ملاقات کا یقین ہوجائے''۔ صاحب! یہ کیسے یہ بات ہوئی؟ یعنی ان پہ غور وفکر کرو تا کہ خدا سے ملاقات کا یقین ہوجائے۔ اور پھر جب لفظِ ملاقات ہمارے ہاں آجائے گا تو وہ ملاقات تو ہم جانتے ہیں۔ دونوں کڑیوں میں ربط نظر نہیں آتا اگر آپ ملاقات کا لفظ لے لیں گے۔

وہ تو یوں ہے کہ جیسے اس جنگل میں چلو پھر و ادھر اُدھر جاؤ وہاں دیکھو تو سہی وہاں تمہارا جو کھو گیا ہوا دوست ہے اس سے تمہاری ملاقات ہوجائے گی۔ تو اس کائنات کی پہنائیوں میں ان چیزوں کے اندر جاؤ' کہیں غور وفکر کرو' ڈھونڈو' تلاش کرو تا کہ خدا سے تمہاری ملاقات ہوجائے۔ وہ خدا جس کے متعلق وہ یہ کہہ رہا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ (6:103) تمہاری نگاہیں' تمہاری آنکھیں اسے پا نہیں سکتی۔ ہماری آنکھیں تو محسوس شے کو پاسکتی ہیں حالانکہ اس خدا کے متعلق کہا یہ گیا ہے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4) تم جہاں ہو خدا تمہارے ساتھ ہے فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (2:115) جدھر بھی نگاہ اٹھا کر دیکھو گے خدا نظر آئے گا۔

قرآنی الفاظ کا اپنی کسی زبان میں ترجمہ قرآنی تصورات کو مسخ کر دیتا ہے جبکہ لفظ لقاء کا مفہوم بھی قابل غور ہے:

تو جس کی کیفیت یہ ہے کہ: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (50:16) وہ رگِ جان سے بھی قریب ہے اس سے ملاقات کے لیے کہنا کہ جاؤ ان جنگلوں میں' ان پہاڑوں میں' ان وادیوں میں' ان دریاؤں میں تا کہ اس سے تمہاری کہیں ملاقات ہوجائے اور پھر ملاقات کی نفی کی ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103)۔

مثال کے طور پہ جیسے ہم کہتے ہیں کہ اگر وہ کہیں کھڑا بھی ہو تمہارے سامنے تو تم تو دیکھ ہی نہیں سکتے اس کو۔ دیکھا آپ نے کہ ایک ترجمہ جو ہے ایک لفظ جس معنی میں ہماری زبان میں استعمال ہوتا ہے اس میں اگر وہ ترجمہ کر دیا جائے کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لفظِ ملاقات نے یہ سب چیز پیش کر دی۔

لقاء آمنے سامنے کو ہی نہیں کہتے ہیں بلکہ ان کے ہاں تو ابتداً یہ چیز کسی چیز کو مس کر لینے کو بھی کہتے ہیں لیکن یہی معنی نہیں ہیں خود ان کے عربوں کے ہاں لغت کے اعتبار سے بھی یہی معنی نہیں۔ خود لغت کے اندر یہ چیز ہے کہ کسی شے کو نگاہِ بصیرت سے اس کا ادراک کر لینا جو ہے یہ بھی لقاء کہلاتا ہے۔ خدا کی جلوہ افروزیاں' اس کی تخلیق کی نادرہ کاریاں' غور وفکر کرو تا کہ یہ چیزیں ابھر کر نکھر کر سامنے آجائیں۔

قرآن حکیم میں خدا کی ذات کے متعلق صرف اللہ کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے جبکہ باقی اس کی صفات ہیں

اور یہ دیکھئے! یہاں اللہ نہیں کہا ہے' اللہ کا لفظ خدا کی ذات کے لیے استعمال ہوتا ہے یہ باقی چیزیں جتنی بھی خدا کی صفات کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ بر بکم ہے ربوبیت اس کی جو ہے اس کا قانونِ ربوبیت ہے۔اور قانونِ ربوبیت تو آپ کو معلوم ہے کہ کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے اس کی پرورش کرتے ہوئے اس کی تکمیل تک لے جانا اسے ربوبیت کہا جاتا ہے۔ کائنات میں غور وفکر سے یہ چیز تمہارے سامنے آئے گی۔اور ابھی آنے دیجئے اگلی آیات میں بتاتا ہے کہ ربوبیت کا قانون کیسا ہے' کس طرح کارفرما ہے۔

کائنات کی بلندیاں اور پستیوں میں خدائے علیم کا نظامِ ربوبیت واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے:

کہا کہ جاؤ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں دیکھو جو چیزیں کارفرما ہیں ان پہ غور وفکر کرو اور وہاں تم اپنی آنکھوں سے خدا کے قانونِ ربوبیت کو مشہود دیکھ لوگے۔ یہیں یہ نہیں کہا اور مقامات میں بھی یہ کہا ہے۔ وہ مقام سامنے لانے سے پہلے میں یہ عرض کروں کہ یہ لفظ توقنون جو ہے اس پہ اور غور کی چیز ہے۔ علم پہلی چیز ہوتی ہے وہاں تو یقین کہا ہے کہ تمہیں اس بات کا یقین آجائے۔ یقین تو بہت بڑی حد ہے' علم کی بھی بہت اگلی حد ہے جسے ہم یقین کہتے ہیں۔اسی لیے قرآن نے دوسرے مقام پہ یہ علم کے جو درجے گنائے ہیں علم الیقین کہا ہے وہ علم کہ جس سے یقین حاصل ہوجائے۔ یہ لقاءرب کا تمہیں یقین آجائے۔

قرآن حکیم میں لفظ لقاء کا استعمال جو بڑا پُرمعنی بھی ہے اور واضح بھی:

عزیزانِ من! یہ ہے جسے ہم نے صرف مذہب کی ایک کتاب بنا کے رکھ دیا۔لقاءرب پہ تمہیں یقین آجائے' جاؤ کائنات میں جا کے غور وفکر کرو تا کہ خدا کے قانونِ ربوبیت کے متعلق تمہیں یقین ہوجائے۔ کہیں یہ قرآنِ کریم نے لقاء کا لفظ مکافاتِ عمل کے لیے استعمال کیا ہے ''تمہارے اعمال کے نتائج محسوس شکل میں تمہارے سامنے آجائیں خدا کے قانون کے مطابق'' اسے بھی لقاء کہا ہے۔آمنا سامنا کسی کا کرنا جسے ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں۔ اعمال تو تیرِ جستہ ہوتا ہے تمہاری کمان سے نکل چکا ہوتا ہے جو تم کر چکتے ہو وہ تو پھر تمہارے سامنے آتا ہی نہیں ہے وہ غیر محسوس ہوجاتا ہے' کہیں جھوٹ بولا ہے اس کے بعد وہ جھوٹ کا کہیں وجود نظر نہیں آتا ہے۔ کہا کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے اوپر یقین ہو تو تمہارا جھوٹ محسوس' مشہود شکل میں تمہارے سامنے آجائے گا' خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین پیدا ہوجائے گا۔اور یہاں رب ہے قرآن میں جہاں جہاں یہ لفظ لقاء آیا ہو ان آیات میں آپ دیکھئے گا جو بھی صفتِ خداوندی وہاں بیان ہوگی اس کو مشہود شکل میں سامنے لانے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوگا۔اور جیسا میں نے عرض کیا ہے لغت میں راغب خود یہ لکھتا ہے کہ بصارت اور بصیرت دونوں سے کسی شے کو دیکھ لینا اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔اور جو شے قرآن نے کہا ہے ابصار سے نظر نہیں

آ سکتی وہ بہرحال بصیرت سے نظر آئے گی۔ چشمِ بصیرت سے خدا کے قانونِ ربوبیت کی جلوہ فرمائیاں ایک ایک پتے میں مشہود نظر آئیں گی۔ میں نے کہا ہے کہ دوسرا مقام بھی لیجئے۔ سوال یہ تھا کہ قرآنِ کریم نے جو کچھ یہ کہا ہے اس کے لیے یہ ثبوت تو واقعی یہ REALITY ہے یہ الحق ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ بتایا تھا کہ حق اور الحق میں فرق کیا ہے؟ THE REALITY۔ یہ قرآن کے متعلق کہ یہ واقعی الحق ہے کس طرح سے یہ بات ثابت ہوگی؟ یہ لفظی مباحثے اور مناظرے قرآن نے نہیں بتائے ہیں' ایک اندھا ایمان نہیں بتایا ہے' ایک اندھی تقلید نہیں بتائی ہے کہا یہ ہے کہ سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ (41:53)

علم وتحقیق کی بنا پر عالم النفس وافاق میں پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے:

عالمِ انفس وآفاق میں' باہر کی دنیا میں اور انسان کی اپنی ذات کے اندر ہماری آیات چھپی ہوئی ہیں۔ جو کچھ اس میں ہو رہا ہے جوں جوں اس پہ پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے' انسانی علم وتحقیق' جیسا میں نے کہا ہے وہ لفظ DISCOVER بڑا صحیح ہے ان کے ہاں جو وہ استعمال کرتے ہیں' COVER جو پڑا ہوا ہے اس کو وہ اٹھاتے چلے جاتے ہیں اس کا نام ہے جسے تحقیق کہا جاتا ہے' انکشاف زیادہ اچھا لفظ ہے جو قرآن نے اس کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں یہاں موجود ہیں' قوانینِ فطرت' فطرت کی قوتیں' انسان کے اندر مضمر صلاحیتیں یہ ساری موجود ہیں ان کے اوپر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تمہاری علم' تمہاری تحقیق' تجسس ان پردوں کو اٹھاتا چلا جائے گا' زمانے کے تقاضے' انسانی علم کا اضافہ' جوں جوں اٹھاتے چلے جائیں سَنُرِیۡہِمۡ اب یہ چیزیں انہیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں پھر یہاں یہ نریھم کا لفظ ہے کہ اس وقت تو یہ چیزیں ہم حقائق کی طرح بیان کر رہے ہیں سمجھنے میں کچھ دقت آ رہی ہے' یہ چیزیں ان پہ پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے تو یہ آنکھوں سے دیکھتے چلے جائیں گے' یہ چیزیں ہم ان کو عالمِ انفس وآفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ (41:53) تا آنکہ یہ بات (بین کے معنی ہوتا ہے کسی بات کا ابھر کے سامنے آ جانا) ابھر کے ان کے سامنے آئے گی'

آج کا یہ دورالنفس اور آفاق میں چھپی ہوئی کارفرمانیوں کا ظہور' قانونِ خداوندی کے الحق ہونے کا ثبوت ہے:

کیا بات؟ اَنَّہُ الۡحَقُّ (41:53) یہ الحق ہے۔ قرآن کے حقائق اور دعاوی کے الحق ثابت ہونے کے لیے یہ ہے کہ انفس اور آفاق کے اندر چھپی ہوئی خدا کے قانون کی کارفرمائیاں ایک ایک کر کے انسان کے سامنے آجائیں۔ اور وہ تو یہ جو سائنس کے محققین ہیں سب سے پہلے تو ان کے سامنے یہ چیزیں آتی ہیں۔ اَنَّہُ الۡحَقُّ (41:53) خیال پیدا ہوا کہ یہ اتنا بڑا دعویٰ اور اس زمانے میں یہ دعویٰ کہ جس زمانے میں اس زمین کے متعلق یہ چیز تھی کہ یہ ایک پڑا ہوا بچھا ہوا بہت بڑا کرہ یا کچھ

بھی ہو یہ پڑا ہے۔ وہ اس زمانے کا پورا آپ کا جغرافیہ یا علم الارض جو تھا وہ یہ ہے اس زمانے کا بطلیموس کا نظام کہ یہ زمین اس طرح سے کھڑی ہے۔ اور کھڑے رہنے کے متعلق سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے کیسے کھڑا جائے۔ تو اس کو کھڑا کرنے کے لیے کہا کہ نیچے پانی ہے پانی میں مچھلی ہے مچھلی پہ بیل ہے بیل کے ایک سینگ کے اوپر یہ زمین ہے۔ تو جب ایک سینگ تھک جاتا ہے تو بیل جب سینگ بدلتا ہے تو زلزلہ اس سے آتا ہے۔

زمین کے ساکن ہونے اور سورج کا اس کے گرد گھومنے کے تصور کے برعکس کوپرنیکس اور نیوٹن کی تحقیق اور قرآن کا اعجاز

عزیزانِ من! یہ اس زمانے کے جہلا کی باتیں نہیں تھیں اس زمانے کے علم الافلاک کے ماہرین کی باتیں تھیں۔ بطلیموسی نظام کہ زمین ساکن ہے سورج اس کے گرد گھومتا ہے یہ کل تک یہی تصور آپ کے ہاں چلا آ رہا تھا یہ نظریہ کل تک ابھی یورپ تک میں چلا آ رہا تھا۔ تاآنکہ کوپرنیکس نے آ کے اور نیوٹن نے آ کے یہ جو نظریہ تھا اس کی تردید کی۔ تو یہ تو ابھی کل کی بات ہے تو چودہ سو سال پیشتر تو اُسی چیز کو حقیقت مانا جاتا تھا۔ تو یہ اتنی بڑی چیز جو قرآن دعویٰ کر گیا ہے کہ زمین بمعہ اپنی تمام مخلوق کے گردش کے اندر بھی ہے اور چلی جا رہی ہے اس قسم کے دعوے کہ كُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ (21:33) ہر کرہ اپنے اپنے ORBIT کے اندر مصروفِ گردش ہے۔ یہ قرآن کیسے یہ دعوے کرتا ہے؟ کہا کہ کیسے کا تمہیں تعجب آ رہا ہے اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ (41:53) اس کے متعلق تو یہ بات کہو کہ جس کے سامنے یہ چیزیں نہ ہوں خدا کے تو سامنے یہ ساری چیزیں ہیں پردے تو تمہاری نگاہوں کے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ اَوَلَمۡ يَكۡفِ (41:53) کہا کہ کیا اس دعوے کے ثبوت کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ خدا کے سامنے کوئی شے بھی پردے میں چھپی ہوئی نہیں ہے مشہود ہے۔ تو جس کے سامنے ایک چیز ہو اور دوسرا وہ ہے کہ جس کے سامنے پردہ ہو پردے کے پیچھے وہ چیز ہو تو دونوں میں کہا کہ جو فرق ہوتا ہے وہی فرق تم میں اور ہم میں ہے۔ خدا کے سامنے ہر چیز مشہود ہے اسی لیے اس نے عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ (59:22) اپنے لیے کہا۔ غیب اور شہادت تمہاری نگاہوں کے مطابق ہے اس کے نزدیک تو کوئی چیز غیب ہے ہی نہیں۔ تو جو چیزیں تمہارے سامنے مشہود ہو گئیں خیر! ان کی تو بات اور ہے جو ان کا علم جانتا ہے، جو بھی تمہاری نگاہوں سے غائب ہیں اسے ان کا بھی علم ہے اس لیے کہ اس کی نگاہوں میں وہ مشہود ہیں وہ غائب ہیں ہی نہیں۔ اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ (41:53)۔

ذاتِ خداوندی کے دیدار کے سلسلہ میں کائنات کا تو ایک ایک ذرہ القاءِ رب کی ایک زندہ تصویر ہے:

اور اس سے اگلی آیت ہے اَلَاۤ اِنَّهُمۡ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ (41:54) اس کے باوجود کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ لقاء رب کے متعلق ان کو شکوک ابھرتے ہیں۔ دیکھا! کہاں لقاء رب آیا ہے۔ کائنات میں چھپی ہوئی آیاتِ خداوندی

سے جوں جوں پردے اٹھتے چلے جائیں گے لقاءِ رب جو ہے وہ ثابت ہوتی چلی جائے گی۔ عزیزانِ من! بات صاف ہے خدا کا یوں سامنے آ جانا یوں مل جانا یوں ملاقات ہو جانا جسے ہم کہتے ہیں یہ بات تو نہیں ہے یہ تو اس کے قانون کی کارفرمائیاں ہیں جو اس طرح سے آفاق کی چیزوں پر غور و فکر سے مشہود ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اور یہاں پھر یہ کہا کہ کہنے والے کے متعلق سوچو کون کہہ رہا ہے۔ آلَآ آگاہ رہو' سمجھ لو اس بات کو آلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (41:54) وہ تو ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔

لفظ محیط کا مفہوم:

اتنی بڑی چیز جو میں نے کہا تھا کہ وہ تصور کہ کہیں جا کر خدا کو ملا جائے؟ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ مثال کے طور پر میں یہ کہہ رہا ہوں سمجھانے کو' خدا کی مثال تو یوں نہیں دی جا سکتی' اس نے تو قرآن میں یہ کہا ہے کہ اس کی مثال بھی نہیں جا سکتی لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (42:12) مثال سے بھی سمجھانا چاہو تو مثال بھی نہیں دی جا سکتی۔ سمجھانے کے لیے محیط جسے ہم کہتے ہیں یہ ASMOSPHERE جو ہے یہ جو ہمیں کچھ نظر نہیں آتا یہ ہم پر محیط ہے' جہاں آپ جائیں گے یہ ATMOSPHERE ہوگا یہ جو ہم سانس لے رہے ہیں محیط اس کو کہتے ہیں' گھیرے ہوئے اس انداز کا جو گھیرا ہوا کوئی چیز ہو کہ کوئی شے اس سے باہر جا ہی نہ سکے۔ وہ کہتا ہے کوئی شے اس سے تو باہر رہی ہوئی نہیں ہے تمہاری نگاہیں ان پردوں کو اٹھا کے دیکھ نہیں رہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(غالب)

خوب تشبیہ دیتا تھا یہ شخص بھی۔ یہ پردہ جسے ساز کا کہتے ہیں یہ اصطلاح ہے موسیقی کی۔ وہ تار' ستار کی وہ اس موسیقی اس آواز کا پردہ کہلاتی ہے جو اس تار کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہے اور مضراب کے چھیڑنے سے جاگ اٹھتی ہے۔ یہ موسیقی کی اصطلاحیں ہیں' اچھی تشبیہ ہے۔ تو کہا کہ یہ خدا جو ہر شے کو محیط ہے اس کے متعلق بس اس سے لقاءِ رب جو ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ جتنی بھی اس کی یہ آیات' قوانین یہاں مضمر ہیں کارگہ' کائنات میں کارفرما ہیں ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتے چلے جایئے خدا کا لقاء ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے معنی ہی ہیں قانونِ خداوندی کی کارفرمائیاں بے حجاب ہو کر تمہارے سامنے آ جائیں گی۔ لیکن جب ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑ گئی یا ہمیں الجھایا گیا اور باتوں میں' اب جناب! وہ لقاءِ رب

مرزا غلام احمد کی خدا تعالیٰ سے ملاقات اور خدا سے لکھوانے کا دعویٰ:

اب ہمارے ہاں کے مقربین یہاں جنہیں ہم کہتے ہیں وہ ان کے حصے میں آیا ان کے دعوے اس کے متعلق ہوئے روزرات کو خدا کے سامنے موجود ہیں ان سے کھیل رہے ہیں باتیں ہو رہی ہیں احکام لکھوائے جا رہے ہیں اور پھر کس شکل میں وہ لکھوائے جا رہے ہیں؟ یہ نہ کہنا کہ یونہی روحانی طور پہ ایسا ہو جاتا ہے' مرزا صاحب نے یہ فرما دیا تھا کہ وہ جو فلاں پٹواری ہے (یہ ان کے اپنے ملفوظات میں درج ہے) ان کا کوئی کام اٹکا ہوا تھا جیسے وہ تحصیلدار نے تبادلہ کر دیا تھا لیکن بہرحال وہ پھر خدا کے حضور گئے وہاں سے

اس کی درخواست کے اوپر حکم لکھنا تھا وہاں سے حکم لکھا یا' یہ ان کے لکھا ہوا موجود ہے کہ اس کے متعلق تمہیں شبہ گزرے شاید کہ یہ نہیں ہوا' کہ دیکھو! آؤ تمہیں میں دکھاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ میاں نے سرخ سیاہی (روشنائی نہیں' سرخ سیاہی!) سے جو دستخط فرمائے تو وہ قلم چلا نہیں تو چھڑکا' اس سرخ سیاہی کے قلم کے چھینٹے جو تھے ان کے کرتے پہ پڑے اور وہ موجود ہے آ کے دیکھ لو۔ انہوں نے کرتہ موجود رکھا ہوا ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ لقاءِ رب ان کے ہاں کا یوں اس کو کہتے ہیں خدا سے ملاقات۔

تفتیشات، تحقیقات اور تجسس کے سلسلہ میں ہم مسلمانوں کی حالت:

عزیزانِ من! کیا کہا جائے کیسا چکر دیا اس قوم کو پوچھو نہیں۔ انفس اور آفاق کے اندر تحقیقات اور تفتیشات اور تجسس کے سارے کارنامے وہ ملحد اور کافر اور بے دین جو ہیں ان کے لیے چھوڑ دیئے اور اپنے ہاں ملاقاتِ خداوندی روز ہوتی ہے اور وہ اس انداز سے ہوتی ہے۔

رحمِ مادر کی زندگی کی طرح اس زندگی میں کوئی انسان جہانِ فردا کی نوعیت اور وہاں کی نشوونما کے طریق کار کا کوئی ادراک نہیں کرسکتا:

ٹھیک ہے مرنے کے بعد کی دنیا جو ہے وہ اور ہے اس کو تو آج ہم سمجھ نہیں سکتے' وہاں کیا صورت ہوگی کیا شکل ہوگی وہاں تو نہ ہم یہ ہم ہونگے وہاں نہ ہمارا شعور یہ شعور ہوگا۔ وہ جو میں اس مثال کے طور پہ کہا کرتا ہوں رحمِ مادر کے اندر پیدا ہونے سے ایک دن پہلے کا بچہ جو ہے سارے حواسِ خمسہ رکھ رہا ہوتا ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اس کی کائنات کیا ہوتی ہے؟ ایک اتنا سا نرم سا تھیلا جس کے اندر باہر کی دنیا نہ ہوا جائے نہ آواز جائے نہ روشنی جائے اب وہ بچہ جو وہاں تقاضا کرے کہ مجھے یہ جو وہ گویا اس میں اور یہ باہر کی دنیا کے اندر دیکھئے کہ ذرا ایک جھلی کا ہی فاصلہ ہوتا ہے اس جھلی کے اندر مستور جو بچہ ہے باہر کی کائنات کے متعلق وہ کہے کہ مجھے سمجھاؤ کہ یہ کیا ہے کیسی ہے کتنی بڑی ہے' سوچئے تو سہی۔

انسان کی اس زندگی اور پھر اس کے بعد کی زندگی کے مابین کیفیت کو برزخ کہا ہے:

اسی قسم کی ایک جھلی ہے جس کے اندر ہم یہاں ہیں اس زندگی کے مقابلے میں جو اس کے بعد آنے والی ہے۔ اسی لیے اس کو آپ کے ہاں نئی پیدائش کہا جاتا ہے اس بچے کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی پوری کائنات سامنے آجائے گی وہ موجود ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ ایک جھلی ہوتی ہے قرآن نے جس جھلی کو برزخ کہہ کے پکارا ہے۔ برزخ کہتے ہی اس قسم کے پردے کو ہیں۔ وہ ایک پیدائش ہے' بچہ موجود ہے' زندہ ہے' پیدا نہیں ہوا اس لیے ہم بھی اس زندگی کے مقابلے میں زندہ ہیں موجود ہیں ابھی پیدا نہیں ہوئے اسی لیے اس کو قرآن نے پیدائش کہا ہے۔ عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں بہت کچھ ہے سینے میں' وقت نہیں ملتا۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (13:2) جاؤ غور و فکر کرو' کائنات کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاؤ ایک ایک پردے کے بعد تمہیں خدا کے قانونِ ربوبیت کی جلوہ فروشیاں جو ہیں بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے تُوْقِنُوْنَ یقین ہو جائے گا

تمہیں اس طرح سے۔ یہ طریقہ ہے یقین حاصل ہونے کا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ پچھلی آیت کے اندر ابھی چند ایک مظاہر کا ذکر آ رہا تھا درمیان میں لَعَلَّكُمْ کہہ کے کہا کہ یہ بات یونہی ہم ایک سائنٹسٹ کی طرح بیان نہیں کیے جاتے کہ ایک کتاب کے اندر ہم نے درج کر دیا ہے' اس کا ایک مقصد ہے اور مقصد ہے لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (13:2)۔

کائنات کی اس قدر وسعت پذیری اور کرۂ ارض کے اس گردشی عمل کے باوجود' اس کا پھسلنے سے محفوظ رہنا کس قدر قابلِ غور ہے

اور پھر آگے چلا وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ (13:3) وہ خدا کہ جس نے زمین کو گول ہونے کے باوجود یوں بچھا دیا ہے کہ تمہیں کبھی محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی گولے کے اوپر چل رہے ہیں۔ یہ جو یہاں سے دوسرے مقام پہ تَمِيْدَ جو VERB بنایا ہے جو وہاں استعمال کیا ہے اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ کوئی شے انتہائی گردش کے اندر وہ ہو لیکن اس کے اوپر جو چیزیں رکھی ہوئی ہوں نہ وہ کہیں گریں نہ وہ کہیں لڑکھڑائیں نہ وہ پھسلیں نہ ہی ان کو احساس ہو۔ اب آپ کہیں گے کہ اس دور میں تو یہ چیز ابھی وہ عربوں کے ذہن میں نہیں' دنیا میں بھی کہیں نہیں تھی تو اس قوم نے الفاظ کہاں سے بنا لیے۔ خدا نے یہ جو چیز کہی وہ تو عالم الغیب والشہادت تھا اس نے تو یہ چیز کہنی تھی' انہوں نے اپنی زبان میں یہ الفاظ کیسے بنا لیے؟ OBSERVATION بڑی عجیب تھی ان کی' وہ استعمال کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ دیکھئے! یہ چکی جو چلتی ہے وہ گھوم رہی ہوتی ہے اس کے اوپر یہ چیونٹیاں وغیرہ چل رہی ہوتی ہیں' دیکھا کہ اس کی اتنی تیز گردش کے باوجود وہ اپنے انداز میں چل رہی ہوتی ہیں۔ تو یہ جو کیفیت ہے کہ کسی چیز کا مصروفِ گردش ہونا اور اس کے اوپر جو چیزیں ہیں ان کا اس سے متاثر نہ ہونا اس کے لیے یہ لفظ انہوں نے بنایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کا یہی لفظ ارض کے لیے استعمال کر دیا۔

اہلِ عرب کی زبان دانی کا کوئی زبان مقابلہ نہیں کر سکتی:

اس کی داد کوئی نیوٹن دے سکتا ہے کہ اس زمانے میں قرآن نے ایک بات ایسی سائنٹفک کہنی ہے اور اس کے لیے یہی زبان موزوں ہو سکتی تھی۔ اور قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ان عربوں نے اپنے ہاں یہ لفظ زبان میں رکھا ہوا ہے ورنہ لفظ قائم کرنے مشکل ہوتے' قائم کرتا تو وہی عرب کہتے کہ صاحب! ہمیں تو پتہ نہیں کہ یہ کیا لفظ آپ کہہ رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس نے قائم نہیں کیا' زبان وہ اختیار کی ہے قرآن نے کہ جس کے اندر ان کے لیے الفاظ موجود تھے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ٹھیک ہے حضرت ابراہیمؑ کے دونوں بیٹے حضرت اسحاقؑ اور حضرتِ اسماعیلؑ تھے۔ حضرتِ اسحاقؑ کی اولاد کے اندر یہ بنی اسرائیل جو تھے یقیناً ان میں مملکت' ملکِ عظیم بھی رہا ان کے ہاں انبیا بھی آتے رہے خانقاہیتیں قائم ہوئیں۔ یہاں وادیٔ غیر ذی زرع کے اندر حضرت اسماعیلؑ آ کے بس گئے۔ یہ ان کی نسل ان کا قبیلہ اتنے ہزار سال کیا کرتے رہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ اتنے ہزاروں سال تک وہ زبان مرتب کرتے رہے کہ جو قرآن کے حقائق کی حامل ہو سکے۔

اس قدر گردش کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ زمین پر پہاڑوں کا ایک لامتناہی
سلسلہ اور چٹانوں کے بدلتے ہوئے رنگوں کی مینہ کاری لقاءِ رب کے سوا اور کیا ہے؟

بہرحال ۔وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ (13:3) مصروفِ گردش ہونے کے باوجود اس کو یوں پھیلا دیا۔ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ (13:3) اور یونہی چیز نہیں ہے کہ ہلکی پھلکی سی ایک چیز ہے اتنے اتنے عظیم پہاڑ اس کے اوپر۔ پہاڑوں کے متعلق تو آپ کو یاد ہے میں نے وہ آیت بتائی تھی کہ جاؤ غور و فکر کرو ان کو یونہی سر ٹکرانے کے لیے بے جان چٹانیں نہ سمجھو' جا کے دیکھو کہ ان کے اندر کوئی سفید دھاری' کوئی سرخ دھاری' کوئی کالی بھجنگ' یہ ایک ہی چٹان کے اندر مختلف قسم کی دھاریاں مختلف قسم کے رنگ۔ اس نے کہا کہ ان کے اوپر غور و فکر کرو' تحقیق کرنے سے تمہیں یہ نظر آئے گا کہ ان کے اندر خدا کا ارتقاء کا ایک سلسلہ جاری ہے۔ قرآن چودہ سو سال پیشتر پتھروں کے اندر زندگی ناچتی ہوئی دکھا رہا ہے۔ وہاں اس نے لقاءِ رب کہا ہے' قانونِ ربوبیت ہے جس کی طرف وہ یہ دلائل یا شواہد پیش کرتا چلا جاتا ہے۔

نظامِ ربوبیت کے سلسلہ میں اس کرۂ ارض پر انگنت پہاڑوں کا وجود' دریاؤں کا
وسیع سلسلہ اور سمندر کے پانی کو کشید کرنے کی غرض سے زمین سے 3 لاکھ
بڑی انمول فیکٹری کا وجود' یہ سب شعبۂ ربوبیت کی تکمیل ہے:

نقطۂ ماسکہ یہاں ربوبیت ہے۔ اسی اعتبار سے یہاں جو پہاڑ کا ذکر آیا ہے تو پہاڑ کے وہ جو اپنے اندر داخلی تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کا یہاں ذکر نہیں کیا' ربوبیت کے لیے کہا وَأَنْهَارًا (13:3) دریاؤں کے لیے ان پہاڑوں کا وجود ضروری ہے۔ اندازہ لگایئے! چودہ سو سال پہلے جب مذہب کی دنیا صرف اِندر دیوتا تک پہنچ سکی تھی کہ ایک دیوتا ہے یہ بادلوں کا ٹھیک ہے بس اس سے بارش ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے دوسرے مقام پہ کہ یہ ساری زندگی پانی پہ ہے اور انہیں کہا کہ ہمارا قانونِ ربوبیت تم نے دیکھا ہے کہ پانی کا ذخیرہ تو سمندر میں ہے جس کا ایک گھونٹ پی لیجیے تو زندگی ملنا تو ایک طرف رہا ہلاکت آفریں ہے۔ وہ جو وہ مشہور پرانی نظم پڑھا کرتے تھے

WATER WATER EVERY WHERE , NOT A DROP TO DRING

NOT A DROP TO DRINK

تو یہ جو پانی ہے اس کی تو کیفیت زندگی کے لیے یہ ہے کوئی پودا اگ نہیں سکتا اگے ہوئے پودے پہ ڈال دیجیے اسی وقت جل کے مر جاتا ہے۔ کہا قانونِ ربوبیت کی کارفرمائیاں یہ ہیں پانی کا سارا ذخیرہ اس ارض کے اوپر' جان کے لیے ہلاکت اور وہی تمہارے لیے ممدِ حیات۔ کیسے بنتا ہے؟ سورج کی حرارت (قرآن کی تشبیہ میں) اس کی کرنیں وہاں سے ڈول بھر بھر کر پانی کا لاتی ہیں' پانی کس قسم کا لاتی ہیں؟ ساری ہلاکت آفریں چیزیں سمندر میں رہنے دیتی ہیں اور اس میں سے

DISTILLED WATER جو ہے وہ اوپر اٹھا کے لے آتی ہیں۔

سمندری پانی کو فلٹر کرنے کی انسانی کوشش صدیوں سے جاری ہے

انسانی جسم میں فلٹریشن کا فریضہ انسان کے گردے سرانجام دیتے ہیں

عزیزانِ من! جن ملکوں میں پانی نہیں ملتا اور سمندر کے کنارے ہیں ان کے ہاں سب سے بڑی PROBLEM یہ ہے کہ یہ پانی پینے کے قابل اور کھیتی کے قابل کسی طرح بنا دیا جائے۔ اس کے لیے پروسیس تو DISTILATION کا ہی ہے کیونکہ اس کے اندر یہ چیزیں ایسے ملی ہوئی ہیں کہ FILTRATION سے تو یہ چیزیں الگ نہیں ہوسکتیں۔ سمندر کی DISTILATION ' اس کے لیے اتنے دریا بنا دینا یعنی پوچھو نہیں اس کے اوپر جو صَرف آئے گا۔ آپ کو معلوم ہے پچاسوں برس سے قومیں اس کے اوپر بیٹھی ہوئی ہیں اس مسئلے کو لے کے۔ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ وہیں انہوں نے ایک چیز پہ غور کیا کہ صاحب! اس طرح سے جو حلول شدہ چیزیں ہیں جن کو الگ کرنے کا' فلٹر کا نہیں ہے' انہوں نے کہا کہ خود خدا نے ایک ایسا فلٹر پلانٹ بنایا ہے کہ اس قسم کی حل شدہ چیزیں بھی اس میں سے الگ ہوجاتی ہیں تو DISTILATION کی ضرورت نہیں فلٹریشن ایسا بناؤ۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ فلٹریشن کا پلانٹ کونسا ہے؟ انسان کا گردہ۔ یہ حل شدہ جوزہریں اندر ہوتی ہیں یا مادے اندر ہوتے ہیں یہ BY PROCESS OF FILTRATION ان کو الگ کرتا ہے۔ آپ کو شاید علم ہو امریکہ کی لیبارٹری کے اندر ساحل کے کنارے' برسوں سے وہ لگے ہوئے ہیں اس گردے کا تجزیہ کررہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اس قسم کی کوئی مشین بن جائے جیسے یہ WORK کررہا ہے مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔

نظامِ ربوبیت کے تحت قدرت کی طرف سے فلٹریشن پلانٹ کی نوعیت اور تقسیم کار

اس نے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ یہ ہمارا DISTILATION کا PROCESS ' سورج کی گرمی جو ہے تمہیں تو یہی نظر آتا ہے کہ رات کو سونے نہیں دیتی' اس نے کہا کہ یہ گرمی جو ہے سورج کی کرنیں وہاں سے DISTILLED WATER جو ہے وہ اوپر لے جاتی ہیں۔ اس لے جانے کے بعد تو اگر ایسا کہیں پروسیس ہو کہ وہاں لے جائیں اور وہیں برس پڑیں تو آپ سوچئے تو سہی کہ ہمیں کیا اس سے۔ پروسیس وہاں کا یہ ہے کہ یہ وہاں سے پھر آگے چلتی ہیں اوپر جس وقت پہنچتی ہیں تو پھر وہ جو ہوائیں ہیں وہ یہ ویپرز جو بنتے ہیں ان کا وہ رخ جو ہیں بدل کے ان کو وہاں سے چلاتی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہمارے گڈریے ہانک کے انہیں لے جاتے ہیں وہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ بدوؤں کو بھی تو بات سمجھانے کی تھی۔ لے آتے ہیں صاحب! بلندیوں کے اوپر پہنچ رہے ہوتے ہیں۔ وہاں آگے پھر پہاڑ کا سلسلہ آتا ہے۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں کے اوپر برف جمی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی آگے قرآن بتاتا ہے کہ یہ کیوں ہوتی ہے لیکن وہاں کی جو سردی ہوتی ہے وہ آپ دیکھتے ہیں پہاڑوں پہ کتنی زیادہ بارش ہوتی ہے۔ اونچائی پہ جتنے چلے

جاتے ہیں ٹمپریچر کم ہوتا چلا جاتا ہے' پہاڑوں کے اوپر برف کی وجہ سے یہ ٹمپریچر کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ واٹر ویپرز جو ہیں جب کسی خاص ٹمپریچر کے اوپر پہنچتے ہیں تو ابخرہ جو ہے وہ سردی سے منجمد ہو کے وہ پھر پانی بنتا ہے پانی اس سے بھاری ہوتا ہے اس فضا سے جس میں وہ معلق ہوتا ہے بھاری ہونے کی وجہ سے زمین پہ گرتا ہے یہ بارش ہوتی ہے۔ وہ اتنا سا تو ہے وہ زمین پہ گرتا ہے' اب جو یہ ہوتا ہے کہ اتنی زیادہ بارش ہوئی ہے سیلاب آ گئے' وہ تو غنیمت ہے کہ سارے کا سارا نہیں گرتا ورنہ ایک ہی سیزن میں بہہ جائے یہ ساری دنیا۔ وہ اس کے مطابق جتنی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق ان دریاؤں کے اندر آنے کے لیے بارش کی شکل ہوتی ہے یہ جو باقی بچتا ہے پہاڑوں کے اوپر ریزر وائر بنے ہوئے ہیں پہاڑوں کے اوپر جو برف ہے وہ انہی ابخروں سے تو بنتی ہے وہ آسمان سے تو اس کے اوپر ڈھیلے پڑتے ہیں وہ وہاں سردی کے موسم میں محفوظ رکھتا ہے' میاں! گرمی میں تمہارے کام آئے گا یعنی وہاں ریز روائر بنا رکھے ہیں۔ اور جب گرمی کا موسم آتا ہے تو وہ جتنی برف پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ پگھلتی ہوئی چلی آتی ہے وہ ساری کی ساری یہ ندی نالوں کی صورت میں آپ کے ہاں یہ بہتی ہوئی چلی آ رہی ہوتی ہے یہ وہ برف ہوتی ہے۔ پھر وہ ساری نہیں پگھلاتا' پگھلا دے تو وہاں ٹھنڈک باقی نہ رہے اگلا پروسیس ختم ہو جائے' وہ جو ہوتا ہے۔ ثمر صرف پھل ہی کو نہیں کہتے بلکہ ہر وہ کھانے کی چیز جو درختوں کے اندر یا فصلوں میں' کھیتوں میں آ جاتی ہے ماحصل اس سارے پروسیس کا ثمر کہلاتا ہے اس سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

زوجین کا وجود میں آنے کا پروسیس:

یہاں قرآن نے یہ کہا ہے زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ (13:3) انہی کے اندر جوڑا بننے کی صلاحیت رکھ دی جاتی ہے۔ یہ افزائش کا سلسلہ آگے جو چلتا ہے یہ زوآلوجی والے جو ہیں ان سے پوچھئے وہ بتائیں گے کہ یہ ساری نباتات کے اندر اسی طرح سے یہ زوج کا سلسلہ ہوتا ہے نر اور مادے کا سلسلہ ہوتا ہے اختلاط کا سلسلہ ہوتا ہے جس سے یہ بات آگے چلتی ہے۔ کب کہا جا رہا ہے؟ چودہ سو سال پہلے۔ حیوانات میں یہ جو زوج ہیں وہ تو چیزیں سامنے آ جاتی ہیں' نباتات کے اندر بادیٔ النظر میں ہم نے کبھی ایسا دیکھا ہی نہیں' ہمارے سامنے تو ہر پھول ایک جیسا ہوتا ہے۔ ان سے پوچھئے آج کے سائنٹسٹ سے پوچھئے وہ بتائیں گے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ سلسلے نے آگے بھی تو چلنا ہے۔ پھر انہی چیزوں کی پیدائش کے لیے جن علاقوں میں چھ مہینے تک وہ رات ہی رات رہتی ہے وہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ وہ ذرا سے اوپر کے علاقے ہیں۔ یہ ہر شے کی اگنے کے بعد اس کی نموڈ' پرورش' تکمیل تک پہنچنے کے لیے سورج کی روشنی نہایت ضروری ہے۔

اجناس کی پیداوار کے لئے سورج کی روشنی اور رات کی تاریکی اور ٹھنڈک دونوں ضروری ہیں:

آپ اپنے ہاں یونہی جسے آپ کچن گارڈن کہتے ہیں یہ یہاں پیچھے مٹی لگی ہوئی ہے جا کے دیکھئے تو سہی' ایک ہی

دن بوئیے' ایک ہی بیج' ایک ہی پانی اس کو دیے جا رہے ہیں ایک جگہ وہ اتنی اتنی سی ہے دوسری جگہ اتنی اتنی اونچی پہنچ گئی ہے۔فرق کس چیز نے پیدا کیا ہے؟ جہاں دیوار کا سایہ رہتا ہے وہ اتنی اتنی ہوتی ہے جہاں سورج کی دھوپ پڑتی ہے وہ اتنی اتنی بڑھ جاتی ہے۔روز آپ دیکھتے ہیں ہوتا یہ ہے' درخت کے نیچے اگا ہوا پودا اتنا سا رہتا ہے۔سورج کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔صحراؤں کے اندر سورج جتنی تپش میں رہتا ہے وہاں کچھ نہیں ہوتا۔اس کے لیے ضروری ہے کہ سورج کی روشنی بھی ملے اور اس کے بعد رات کی ٹھنڈک اور تاریکی بھی ملے۔ وہ کہتا ہے کہ: يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ (13:3) لفظِ غشیٰ جو ہے پھر یہ آگے آ گئی چیز۔

ربوبیت کی خاطر نظامِ قدرت کی یہ پیوندکاری ہر لحاظ سے مکمل اور حیران کن ہے:

میں نے گزارش کیا ہے کہ یہ تو نصاب کی کتاب ہے۔یعنی وہ دن کہیں چلا نہیں جاتا وہ رات کہیں بھاگ نہیں جاتی یہ تو ایک گردش ہی کا نام ہے' وہ کہتا ہے موجود ہوتی ہیں' وہ ایک چیز ڈھانپ لیتی ہے' کہیں جاتی تو نہیں ہے۔رات اور دن کی گردش' ربوبیت کے لیے یہ ساری جتنی چیزیں ضروری ہیں یہ چیزیں ہیں جو بیان ہو رہی ہیں۔اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ (13:3) ان چیزوں کے اندر بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے نشانیاں ہیں' علامات ہیں یہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے۔کس کے لیے علامات ہیں؟ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (13:3) ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔صاف مصفّٰی پانی بھی آ گیا جس سے کھیتیاں ہیں' مَدَّ الْاَرْضَ زمین بھی بچھا دی' پھر دن اور رات' روشنی اور حرارت اور سکون کے لیے بھی انتظام خود ہی کر دیا۔ایسی ایک عجیب AUTOMATIC لگی ہوئی مشین ہے وہ خود بخود ہی بدلتی چلی جاتی ہے' دھوپ کو بھی' روشنی کو بھی' تاریکی کو بھی' ہم سو رہے ہوتے ہیں خود بخود ہی دن برآمد ہو رہا ہوتا ہے۔یہ اتنا بھی نہیں ہوتا ہے کہ ہمیں اٹھ کے کہیں جا کے پردہ اٹھانا پڑے کہ پھر دھوپ نکلے' ساری دنیا سو جائے' ضرورت ہی نہیں ہے اٹھ کے کچھ کرنے کی وہ AUTOMATIC ہو رہی ہوتی ہے' سورج نکلتا ہے۔یہ سارے انتظامات ہو گئے۔کہا دیکھو تو سہی وہی تمہارے ہاں کی زمین ہے وہی پانی ہے وہی سورج ہے۔وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (13:4) ساتھ ساتھ ملی ہوئی زمین ہوتی ہے۔وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ (13:4) اور اسی زمین میں سے جو اسی قسم کی ہوتی ہے وہی پانی' وہی سورج' وہی رات' وہی دن' یہاں سے ببول کا درخت اگ رہا ہے' اُسی میں سے انگور نکل رہے ہیں اسی میں سے کھجوریں اگ رہی ہیں آم تھے محروم تھے ورنہ ہم کہتے اسی میں سے ثمرِ بہشت آ رہا ہے لنگڑا بھی اگ رہا ہے۔آم کا ذکر ضرور آنا تھا اگر یہ عربوں کے ملک میں ہوتا۔کہا ذرا دیکھو تو سہی ربوبیت کا کارفرمائیاں۔

کھانے کے اندر لذت اور تنوع انسانوں کے لئے ہے جبکہ حیوان اس نعمت سے محروم ہیں:

عزیزانِ من! یہ جو کھانے کی چیزوں میں تنوع ہے یہ انسان کے لیے بڑی چیز ہے۔حیوانات تک تو یہ بات ہے کہ وہ صرف پیٹ بھرنا جانتی ہیں لب و دہن کی لذت جو ہے اس سے ناآشنا ہیں۔اگر جتنی چیزیں ہمیں کھانے کو ملتیں وہ

ایک ہی مزا ان کا ہوتا وہ ایک قسم کی خوراک ہوتی' مرتے بھرتے اس کو کھاتے تو ضرور ایسے ہی کھاتے جیسے جیل خانے میں قیدی کھاتا ہے' جیل خانے کی فضاؤں میں اذیت رساں چیز جو وہاں ہوتی ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ روز وہی کچھ ملتا ہے۔ وہ ترس جاتے ہیں اتنے سے گڑ کی بھیلی کے لیے' منہ کا مزا بدلنے کے لیے' وہاں سزا برداشت کر لیتے ہیں اتنی سی بھیلی چراتے ہیں۔

زمین کے اندر سے ہر اُگنے والی چیز اپنی جگہ ایک الگ ذائقہ اور الگ شکل لئے ہوتی ہے:

تو سوچئے تو سہی کہ اگر وہی نظام یہاں بھی ہوتا کہ جی ہاں! دیتے تو ہم بہت ہیں' روز وہی کچھ ملے گا' وہی ذائقہ ہوگا۔ تو یہ بدلے گا کیسے؟ کہا بدلے گا! دیکھو تو سہی اس زمین کے اوپر' اسی زمین' اسی پانی' اسی روشنی' اسی حرارت سے تم دیکھو تو سہی کہ ساتھ کے ساتھ قطع کے اندر جو چیزیں اگ رہی ہیں لذت میں مختلف' خوشبو میں مختلف' رنگ میں مختلف۔ عزیزانِ من! وہ ربوبیت جو اس کے ہاں کی ہے اس میں تو ہمارے اس ذوقِ لطیف کی اس نے اتنی رعایت رکھی ہوئی ہے کہ آنکھوں کا سامان بھی اس کے اندر ہوتا ہے۔ اور یاد رکھیے! پھل کی پہچان جو ہوتی ہے وہ ہمارا ایک دوست باتیں شاعرانہ انداز میں کیا کرتے تھے' کہنے لگے کہ ٹوکری میں پھل کا ڈھیر لگا ہوا ہو اس میں بعض دانے جو ہیں وہ خوب آنکھ مار دیتے ہیں۔ جتنا خوبصورت شکل پھل کی ہوگی اور وہ ابھرا ہوا ہوگا' جھریاں بھی نہ ہوں' جوانی کا عالم ہو' دیکھنے میں جتنا خوبصورت ہوگا آپ دیکھیں گا اتنا ہی زیادہ وہ لذیذ ہوگا اور اتنی ہی اس کی تاثیر زیادہ ہوگی۔ نگاہوں کے لیے لذت' رنگتیں ان کی مختلف۔ بعض رنگ تو ایسی حسین ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں تو یہ؟؟؟؟ جو ہیں وہ محنت کر کر کے اس رنگ کے مطابق رنگ ملاتے جاتے ہیں۔ یہ عنابی رنگ کیا ہوتا ہے؟ یہ عنابوں سے ہوتا ہے۔ رنگت مختلف' ذائقہ مختلف' لذت مختلف' پھر اس کے بعد کے اثرات مختلف' وہ کہتا ہے اسی زمین سے یہ سارا کچھ ہے۔ کہا کہو! کیا یہ قانونِ ربوبیت جو ہے اس سے ملاقات ہوجاتی ہے یا نہیں ان چیزوں سے آپ کی۔ صِنۡوَانٌ وَّغَيۡرُ صِنۡوَانٍ (13:4) کہتا ہے پھر وہ کھجور دیکھ لیجیے ایک تو یونہی پورے کا پورا درخت اوپر نکل آتا ہے ایک دوسرے قسم کی ہوتی ہیں کہ اس میں سے شاخیں پھوٹتی ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اس کے بعد دیکھئے اس کے پھلوں میں کتنا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ تو خیر وہ عرب ہی جان سکتے ہیں۔ اگلا لفظ ہے کہنے لگا يُّسۡقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ (13:4) یہ اس کے اندر سے جو کھاتے وقت ذرا سا گھونٹ منہ میں آتا ہے اس میں یہ فرق ہوتا ہے اس لذت کے اندر پہلا فرق' کہتا ہے ایک ہی قسم کے پانی سے یہ مختلف قسم کے گھونٹ تمہیں آرہے ہیں۔ وَنُفَضِّلُ بَعۡضَهَا عَلٰى بَعۡضٍ فِى الۡاُكُلِ (13:4) اور پھر کھانے کے اندر آپ دیکھئے کہ ایک کی لذت دوسرے سے کس قدر فائق ہوتی ہے لذیذ تر وہ چیز ہوتی ہے۔ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ (13:4) ان میں بھی بڑی بڑی نشانیاں ہوتی ہیں لیکن کن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں؟ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ وہ قوم جو عقل وفکر سے کام لیتی ہے۔ وہاں تُوۡقِنُوۡنَ (13:2) کہا تھا پھر يَّتَفَكَّرُوۡنَ (13:3) کہا ہے پھر يَّعۡقِلُوۡنَ

(13:4) کہا ہے۔

دینِ خداوندی انسان کو قدم قدم پر عقل وفکر کی دعوت دیتا ہے

جبکہ مذہب عقلِ انسانی کو پامال کر دیتا ہے:

عزیزانِ من! مذہب کے سٹیج پہ کھڑے ہو کے گفتگو ہو رہی ہے جہاں پہلی آواز ہمارے کان میں یہ کہتی ہے کہ مذہب کے معاملے میں سوچنا جو ہے یہ منع ہے اول من قاس ابلیس سب سے پہلے جس نے فکر سے سوچ سے کام لیا وہ ابلیس تھا۔ یہ کہتے ہیں کہ اس نے منطقی دلیل دی تھی اس نے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا تو اس میں یہ منطق ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا مجھے آگ سے پیدا کیا آگ مٹی سے فائق ہوتی ہے اس کو میرے سامنے جھکنا چاہیے مجھے کیوں جھکنا چاہیے منطق ہے۔ اب ان کے ہاں کلیہ بن گیا کہ صاحب! دیکھا اس نے عقل سے کام لیا تھا ساری عمر کے لیے مارا گیا ایک دفعہ عقل سے کام لینے سے۔ اگر تم ساری عمر عقل سے کام لو گے! وہ قدم قدم پہ یہ کہہ رہا ہے اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (13:4)۔ اور جن قوموں نے بھی فکر اور عقل اور تفکر سے کام لیا ہے وہ یقین کے درجے پہ پہنچ گئی ہیں۔ عزیزانِ من! اس میں تو آپ کے ہاں کے اصطلاحی کفر اور ایمان کا بھی فرق نہیں ہے۔ جنہیں آپ دنیا بھر کا ملحد اور کافر کہتے ہیں انہوں نے غور وفکر سے کام لیا ہوا ہے۔

دین کائناتی چیزوں کو مسخر کرنے کے بعد اس ماحصل کو ربوبیت عالمینی کے تحت صرف کرنے کا سبق دیتا ہے:

آگے ایک چیز اور آتی ہے جہاں جا کے کفر اور ایمان کا فرق پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا جو ماحصل ہے کائنات کی قوتوں سے یہ سارا سامانِ ربوبیت جو ملتا ہے اس کو استعمال کس طریق سے کیا جائے' یہ ہے جو وحی دیتی ہے یہ عقل اور فکرِ انسانی نہیں دے سکتی۔ یہاں کفر اور ایمان کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ بات آگے بڑی عجیب شروع ہوتی ہے۔ وَاِنۡ تَعۡجَبۡ (13:5)

عزیزانِ من! یہ ساری باتیں آپ نے سنی ہیں اس دور میں جب علم اتنی ترقی کر گیا سائنس کے انکشافات ہمارے ہاں اتنے ظاہر ہو گئے یہ چیزیں جو بیان کی جا رہی ہیں ان میں کچھ زیادہ کوئی تعجب انگیز سی حیرت فروش باتیں نہیں ہیں یعنی عام طور پہ اب یہ علم عام ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود آپ دیکھ رہے ہیں ہم باتیں کر رہے ہیں تو ایک حیرت ہم پہ آ جاتی ہے ایک تعجب کی بات آ جاتی ہے کہ ہاں صاحب! واقعی عجیب چیز ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک تمہارے لیے تعجب کی بات یہ ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اُٹھائے جاؤ گے:

قرآن کہتا ہے اِنۡ تَعۡجَبۡ یہ کچھ سن کے تمہیں کچھ تعجب ہوا ہے حیرت کچھ ہوئی ہے۔ کہا یہ باتیں وجہ حیرت نہیں ہیں وجہِ حیرت ایک اور بات ہے وہ سنو اور اس پہ تعجب کرو اور وہ وجہِ حیرت یہ ہے فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ

خَلْقٍ جَدِيْدٍ (13:5) وجۂ حیرت یہ بات ہے جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا مرنے کے بعد ہم پھر زندہ ہو جائیں گے۔ آ ہاہاہا! میں کہتا ہوں بات کہنے کا انداز کتنا عجیب ہے۔

عزیزانِ من! ہم سب ان چیزوں کو سن کے آج بھی اس وقت بھی اس محفل میں بھی ہم محوِ حیرت تھے تعجب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہمیں مخاطب کر کے وہ کہتا ہے کہ او! تم تعجب میں ڈوبے ہوئے ہو حیرت تم پہ چھا رہی ہے۔ اگر کوئی وجۂ تعجب ہے تو یہ نہیں ہے جو تم نے سنی ہے آؤ ہم تمہیں بتائیں تعجب کرنے کی بات کیا ہے؟ تعجب کرنے کی بات ہے جو یہی کہتے ہیں کہ کیا مرنے کے بعد ہم زندہ ہو جائیں گے ان کی اس بات پہ تعجب کرو۔ کسی بات کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اتنی بڑی یقینی چیز ہے اسے بیان یوں کرنا کہ او ان چیزوں پہ تعجب کر رہے ہو یہ تو وجۂ تعجب ہی نہیں ہیں وجۂ تعجب ان کی یہ بات ہے جو یہ کہہ رہے ہیں' پاگل کہیں کے نہ ہوں تو۔

Stone کی طرح سخت کھجور کی گٹھلی کا پرورشش پا کر پھل دینا کیا یہ حقیقت نہیں؟

عزیزانِ من! سوچئے! ایک گٹھلی وہ بھی آپ کھجور کی دیکھیں گے تو پیسئے گا تو وہ بے جان ستو سا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں ان گٹھلیوں کو STONE کہتے ہیں۔ سوچئے تو سہی! زمین کی مٹی میں وہ ملا دی جاتی ہے اور اس کے اندر سے ایک زندہ چیز پیدا ہوتی ہے وہ خود اپنی پرورش کا سامان لیے ہوئی بڑھتی چلی جاتی ہے ابھرتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کے اندر اس قسم کے پھل لگتے ہیں یہ سارا کچھ اس STONE سے یہ پیدا ہوا جو اسی قسم کی مٹی میں مل گئی۔ اب دیکھئے! بات کہاں سے کہاں آ گئی۔ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے قرآن یہ SCIENTIFIC چیزیں بیان کر رہا ہے' سائنس کی کتاب نہیں یہ کہنے کے لیے وہ بات کر رہا ہے کہ یہ چیزیں چونکہ روزمرہ ان کی آنکھوں کے سامنے واقع ہوتی ہے اس پہ تو کبھی ان کو تعجب نہیں ہوا کہ صاحب! یہ کس طرح سے ایک ایک STONE سے' گٹھلی سے جو ان کی نگاہوں میں بے جان ہے (ان کی نگاہوں میں میں نے کہا ہے) اس سے اسی قسم کی بے جان مٹی میں ملنے سے یہ سارا کچھ تمہارے سامنے آ جاتا ہے۔

موجودہ تحقیق کے مطابق کھیتوں کے کنارے میوزک دوگنی پیداوار فصل کا باعث بنتا ہے جبکہ ڈیری فارم میں میوزک کی آواز سے گائے زیادہ دودھ دیتی ہے:

اور اب تو تحقیق یہ بھی ہو گئی اور اب یہ ساری چیز دنیا میں پھیل گئی ہے کہ ان نباتات' پودوں کے اندر احساس ہوتا ہے' دکھ درد تکلیف اور اذیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان پودوں کی کیفیت یہ ہے اب اس پہ تجربہ ہو رہا ہے خاص قسم کا میوزک کھیتوں کے کنارے پہ بجا دیتے ہیں اس سے فصل دوگنی ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! میں ان کا میوزک کہتا ہوں یہاں کا نہیں کہتا ہوں کہ جس سے کم بخت زندہ بھی مر جاتا ہے۔ بہرحال شرافت اور نجابت' اخلاقیات' حیا' شرم یہ تو اس میوزک کے صدقے میں مرتے ہوئے روز ہم دیکھ رہے ہیں۔ ایک ان کے ہاں کا میوزک ہے ڈیری فارم میں جا کے رکھ دیتے ہیں لے جا کے آپ کو بتا دیتے ہیں کہ اسی گائے نے کل یہ ایک بالٹی دودھ

کی دی تھی اور وہاں جو وہ بھیروی کی ٹیون وہاں شروع کر دیتے ہیں دوگنا دودھ دے دیتی ہے' دوگنی فصلیں لے رہے ہیں۔ یعنی ان کے اندر احساسات یہاں تک ہیں۔ وہ ایک گٹھلی جسے STONE کہہ کے پکارا گیا تھا زمینِ مردہ کے اندر وہ داخل ہوتی ہے اور اس میں سے یہ چیزیں جو ہیں یہ پیدا ہوتی ہیں۔

انسان کا مٹی میں دفن ہونے کے بعد کھجور کی گٹھلی کی طرح

ایک جہانِ نو سے متعارف کرانے کا پروگرام:

کہا یہ سب چیزیں یہ دیکھنے والے! کہا کہو! ان کا یہ کہنا جو ہے یہ زیادہ وجۂ تعجب ہے یا یہ زیادہ وجۂ تعجب ہے کہ گٹھلی سے پودا کیسے ہوگیا۔ وَاِنۡ تَعۡجَبۡ (13:5) ان باتوں پہ تعجب کرنے والو! یہ وجۂ تعجب نہیں ہیں' آ ؤ ہم بتائیں وجۂ تعجب کیا بات ہے؟ تعجب کرنا ہے تو ان کی اس بات پہ تعجب کرو کہ کیا ہم جب مٹی میں ملا دئے جائیں گے تو وہاں سے پھر نمود ہوگی۔ کہا! ان سے پوچھو کہ روز جا کے اپنی ان گٹھلیوں کو مٹی میں ملا کے آتے ہو لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ (13:5) وہ خلقِ جدید کے اندر نمود اس کی ہوتی ہے یا نہیں' وہ جو کونپل پھوٹتی ہے وہ گٹھلی جیسی ہوتی ہے؟ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ۔ اس گٹھلی کو باہر میز کے اوپر پڑا رہنے دو' ساری عمر پڑا رہنے دو پھر دیکھو تو سہی اس میں تو خلق جدید نہیں ہوتی۔ پھر وہ جو ہمارا قانون ہے کہ اس میں اتنا پانی دو' اس کو اتنی ہوا ملے' اتنی روشنی ملے' اس کے تابع تم دیکھتے ہو کہ وہ خلقِ جدید جو ہے وہ نمودار ہوتی ہے۔

خدا تعالیٰ کا نظامِ ربوبیت تو کروڑ ہا سال سے آگے ہی آگے چلتا جا رہا ہے

اور اہل بصیرت کے لئے تو ابھی سینکڑوں منازل اور باقی ہیں

انسان کی یہ جو موت جسے تم یہ کہہ رہے ہو زیادہ سے زیادہ یہی کہو گے کہ یہ ایک کھجور تھی یہ اس کی گٹھلی بن گئی جس میں زندگی کی نمود کہیں نہیں مل رہی' لاش کو یہی کہو گے ایسا ہی ہے موت یہی کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے کرتی ہے۔ تو یہ جتنی مردہ چیزیں ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ زندہ ہو رہی ہوتی ہیں یا نہیں؟ اپنے متعلق جب بات آتی ہے تو وہاں کیوں تمہیں موت پڑ جاتی ہے۔ لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ (13:5) یہ کیسے ہو رہا ہے؟ قانونِ ربوبیت ہے کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہمارا قانونِ ربوبیت کروڑ ہا کروڑ سالوں سے جو چلتا ہوا ایک جرثومے سے بات شروع کی اور پیکرِ آدمیت تک وہ ربوبیت آ گئی' اب فرق صرف اتنا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ ہمارے پروگرام کی تکمیل ہوگئی اور ہم یہ کہتے ہیں کہ نہیں! تکمیل کی طرف لے جانے والی ایک کڑی ہے تکمیل ابھی اور آگے ہونی ہے۔ وہی قانونِ ربوبیت ہے جس نے آگے بھی اس گٹھلی کو ایک درخت کے اندر تبدیل کرنا ہے۔ کہا اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ (13:5) یہ پتہ ہے! کس چیز سے انکار کرتے ہیں؟ اس کے قانونِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں' سمجھتے ہیں کہ ربوبیت کی تکمیل ہوگئی' یہ سلسلہ ختم ہوگیا آگے نہیں بات چلتی' قانونِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں۔ کیوں یہ انکار کر رہے ہیں' اقرار کس طرح سے ہونا تھا' یقین کیسے آنا تھا؟ تو قنون جو کہا ہے غور و فکر سے'

تعقل سے، بصیرت سے، تجربات سے، مشاہدات سے، مطالعہ سے یوں یہ چیز آنی تھی۔ کہاان کی کیا کیفیت ہے؟ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ (13:5) گردنیں زنجیروں میں بندھی ہوئی، جھکی ہوئی، دیکھنے کے قابل ہی نہیں۔

لفظ تقلید کا مفہوم عقل وفکر سے محروم:

آپ کو پتہ ہے یہ لفظِ تقلید جو ہے کس کو کہتے تھے؟ قلدۃ یہ جو بھینس گائے کے گلے کے اندر وہ ایک طوق سا ڈالا ہوا ہوتا ہے وہ ڈالے ہی رکھتے ہیں اس سے رسی ساتھ باندھتے ہیں۔ تو وہ جو اس طرح سے وہ باندھا ہوا ہوتا ہے کہ جس کے بعد پھر وہ اس کو جدھر جی چاہے کھینچ کے لیے چلے جایئے اس کی ساری آزادیاں سلب ہو جاتی ہیں یہاں سے ہے یہ تقلید۔ تو کہا کہ تقلید کی اغلال گویا کچی رسی بھی نہیں جو ٹوٹ جائے تقلید کی مضبوط زنجیر گلے میں پڑی ہوئی ہے۔ سمجھنے سوچنے فکر کرنے کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں جب یہ چیز ہو۔ جب یہ بات ہو کہ صاحب! یہ چیز ہمارے ہاں اسلاف کرتے چلے آرہے ہیں ہم بھی یہ کہہ رہے ہیں یہ ہے چیز۔ قرآن نے کہا ہے کہ گردنیں زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں سر کو اوپر ہی اٹھنے نہیں دیتیں ادھر اُدھر دیکھنے کی آزادی ان کو نہیں مل سکتی۔ وہی سامنے کا وہ راستہ، پچھلی بھیڑ سے پوچھئے کہ تم ادھر کیوں جارہی ہو؟ وہ یہ کہے گی کہ اگلی جو جا رہی ہے۔ تقلید کے اندر سوچ کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ کہتا ہے یہ اس لیے ہے۔ جس راستے کے اوپر چلے آرہے ہیں اس راستے کے اوپر چلے جارہے ہیں۔ جن کے ہاں کے جغرافیہ میں آج بھی تین ہی برِاعظم ہوں کیونکہ وہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب یہ دو ابھی یہ آسٹریلیا اور امریکہ دریافت نہیں ہوئے تھے ان کا اضافہ ہی نہیں ہوتا۔

دلچسپ سی بات یاد آ گئی۔ لارڈ کرزن تھا وہ علیگڑھ یونیورسٹی میں گیا تھا وہاں جغرافیہ کے ایک پروفیسر تھے ان کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی۔ تو اس نے جا کے یہ پوچھا کہ جی! جب آسٹریلیا دریافت نہیں ہوا تھا تو دنیا میں سب سے بڑا جزیرہ کونسا تھا؟ تو انہوں نے نام لے دیا ہو گا کسی ایک جزیرے کا جو اس زمانے میں سب سے بڑا تھا۔ کرزن نے کہا کہ نہیں جناب! میں تم سے زیادہ علم کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اتنی سی بات کہتا ہوں کہ اس وقت بھی سب سے بڑا جزیرہ بھی آسٹریلیا ہی تھا دریافت نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ جو گلے کے طوق ہوتے ہیں اغلال، ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تین ہی برِاعظم مانتے تھے اب تک یہ مانتے ہیں کہ یہ زمین اسی طرح سے ساکن پڑی ہوئی ہے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں ہے یہ جو کچھ کرتے ہیں ان کے اس طرح سے سر جھکائے ہوئے، حیوانوں کی طرح نیہوڑائے ہوئے، گردن جھکائے ہوئے، ایک راستے کے اوپر بندھے ہوئے چلے جانے سے کائنات کا کچھ نہیں بگڑتا ہمارے قانونِ ربوبیت کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہوتا کیا ہے؟ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (13:5) ان کی جتنی بھی امیدوں کی، ترقیوں کی، علم کی دنیائیں ہیں وہ ساری جھلس کر رہ جاتی ہیں آگے چل ہی نہیں سکتا۔ اور یہ کوئی وقتی بات نہیں ہے هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (13:5) جب تک گردن کو اسی طرح سے جھکائے ہوئے حیوانوں کی طرح چلتے چلے جائیں گے اسی کیفیت کے اندر یہ رہیں گے یہ کیفیت بدل نہیں سکتی۔

یہاں تو پھر سر اٹھا کر چلنا ہو گا چاروں طرف دیکھ کر چلنا ہو گا یہ اس لیے کائنات ہم نے بنائی تھی یہ چیز کرو گے پھر یہ صورت پیدا ہو گی ورنہ تمہاری امیدوں کی، فارغ البالیوں کی، آزادیوں کی، ترقیوں کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ کہتا ہے اس کے

اوپر یہ بات کہیں گے کہ صاحب! وہ تو نہیں جھلس گئیں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ٹھیک ہے۔ آپ قرآن میں دیکھیں گے وہ بار بار یہ کہتے ہیں کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ ہمارے غلط نظام سے۔

فلسطین کی وہ وادی جس کا نام جہنی تھا یہاں ایک بت کے سامنے انسانوں کو جلا کر قربانی دیتے تھے:

یہ تو کائنات کی بات آ رہی تھی آگے نظام کی بات آتی ہے کہ یہ سب کچھ بھی ہو نظام غلط ہو تو پھر بھی انسانیت کی کھیتی جو ہے وہ جھلس جاتی ہے اس وقت یہ سامان نہیں جلتا اس وقت پھر انسان جلتا ہے۔ تو آپ کو پتہ ہے یہ جہنم جو قرآن نے لفظ استعمال کیا ہے یہ کس کے جلنے کے لیے کہا ہے؟ سامان نہیں جلتا ہے۔ یہ SANATIC زبان میں یہ ایک مشہور چیز تھی وہاں فلسطین کے اندر ایک وادی تھی جہنی اس وادی کا نام تھا اس وادی کے اندر ایک بہت بڑا بت تھا تو اس بت کے سامنے زندہ انسانوں کو جلا کر قربانی دیتے تھے۔ جہاں انسانیت کو جلایا جاتا ہو کسی کی انسانیت جلتی ہو وہاں سے یہ لفظ لے آیا ہے قرآن' جہنم کے معنی وہ وادی وہ مقام جہاں انسانیت جل جاتی ہے۔ انسانیت کب جلتی ہے؟ جحیم کا لفظ پھر وہ لایا ہے جحم کے معنی ہی ہیں کسی چلتی ہوئی چیز کا رک جانا۔

جہاں سلسلۂ ارتقاء رکتا ہے وہاں ٹھیک ہے محسوس' مشہود' طبعی سامان جو ہے ہزار درجے کے اوپر محفوظ رہے اس کو محفوظ بھی رکھا جا سکتا ہے' انسانیت جل جاتی ہے جب ارتقاء رک جاتی ہے۔ ارتقاء کے رکنے کا نام جحیم ہے اس لفظ کا ترجمہ یہی ہے روک کو کہتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ہے جسے قرآن جہنم کہہ کے پکارتا ہے۔ تو یہ سارے ساز و سامان تو رہتے ہیں بہت بڑھتے چلے جاتے ہیں یہ چیز ہوتی ہے۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

جہنم میں تو جل جاتا ہے۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ (13:6) کہا اس نظام کی خرابیاں تم بتاتے ہو اور ان سے کہتے ہو کہ تباہ ہو جاؤ گے برباد ہو جاؤ گے۔ ہر جگہ قرآن نے ان سے کہا ہے کہ جب یہ تم کہتے ہو تو کہتے ہیں کہ کیوں نہیں وہ تباہی آتی کیوں نہیں وہ بربادی آتی۔

کسی عمل کا نتیجہ نکلنے کا وقفہ بھی ایک رحمت ہے تاکہ انسان اپنی غلطی کا ازالہ کر سکے:

قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی ہماری ایک رحمت ہے کہ ہم نے عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ دے رکھا ہے ایک مہلت دے رکھی ہے۔ وہی مثال ہے بیج کے فصل بننے تک کے لیے ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ کہتے یہ ہیں کہ نہیں صاحب! وہ وقفہ نہیں ہونا چاہیے اُدھر سے بیج ڈالا اُدھر سے اُگا کے بتا دو جب ہم مانتے ہیں۔ کہا یہ کس چیز کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ اگر تو یہ چیز ہو کہ صاحب! نہیں جی! تیس کا چاند کچھ نہیں وہ عید کیا ہوئی' جلدی انتیس کو نکل آنا چاہیے ٹھیک ہے عید کے لیے تم کہتے ہو کہ ایک

خوشی کی چیز آنے والی ہے۔ کہتا ہے کم بختوں سے کہا یہ جاتا ہے کہ تمہاری تباہی آ رہی ہے تو تمہیں کچھ خوش ہونا چاہیے کہ چلو کچھ وقت تو مل گیا ہوا ہے ٹل رہی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وقفہ جتنا ہے اس کو ختم کر کے وہ اب کیوں نہیں آتی۔ کہتا ہے ان کی عقلوں کو دیکھئے کسی اچھی چیز کے لیے اگر جلدی کوئی کرے تو بات بھی ہے یعنی اگر یہ کہا جائے کہ صاحب! وہ پوسٹ مین جو ہے اس کو جلدی آنا چاہیے میرے لیے منی آرڈر لائے تو بات بھی ہوئی۔ وہ پراپرٹی ٹیکس والا جو آنے والا ہوتا ہے اس کے لیے تم کہہ رہے ہو کہ بڑی جلدی اس کو آنا چاہیے۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ط (13:6) پھر غور و فکر کی طرف آ گیا' تاریخ اب سامنے آ گئی۔ حالانکہ ان سے پہلے ان کے سامنے ایسی گزر چکی ہیں جو ان کے لیے مثال بن سکتی ہیں کہ جو کچھ یہ معاشرے میں کر رہے ہیں اس کا نتیجہ وہ نکلا کرتا ہے۔ نتیجہ تو ان کے سامنے ہے زور لگا رہے ہیں آپ کو تاکید کر رہے ہیں بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ وقفہ پھر کیوں ابھی کیوں نہیں موت آ جاتی۔ کہا وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ج (13:6) آہاہاہا! پھر رب آیا ہے۔

یہ بھی اس کا قانونِ ربوبیت ہے یہ بھی اس کی قانونِ رحمت ہے کہ عمل کے نتیجے میں فوراً تباہی نہیں آ جاتی لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ وہ حفاظت کا سامان دیتا ہے مہلت کا وقفہ حفاظت کا سامان ہے۔ حادثے سے فوری موت واقع ہوتی ہے کسی مرض سے فوری موت واقع نہیں ہوتی اس میں وقفہ ضرور ہوتا ہے' یہ وقفہ کیا ہے؟ حفاظت کا سامان ہے کہ اب بھی جان بچ سکتی ہے اب بھی جان بچ سکتی ہے۔ یہ کیوں دیا ہے یہ حفاظت کا سامان؟ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَ (13:6) اس کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سامانِ حفاظت پہنچاتا چلا جائے۔ عزیزانِ من! لفظ ہے عَلٰى ظُلْمِهِمْ تمہاری ان ساری زیادتیوں کے باوجود وہ پھر بھی تمہیں موقع دیتا چلا جاتا ہے عَلٰى ظُلْمِهِمْ اور جب یہ وقت ختم ہو جاتا ہے تو ان سے کہو کہ ڈرانا نہیں ہے' دھمکی نہیں جو ہم دے رہے ہیں اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (13:6) یہاں عقب ہے' پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے آ کر دبوچے گا۔ اس کا جو قانونِ ربوبیت ہے مغفرت کا جو حصہ ہے اسے تو تم کو غنیمت سمجھنا چاہیے وگرنہ اس کے پکڑنے میں دیر کیا لگے گی مشکل کیا ہے اس کے لیے۔ وہ تو جب ہو کہ تم اکیلے کہیں اشتہاری مجرم بن رہے ہو کہیں پکڑے ہی نہ جا رہے ہو انڈر گراؤنڈ چلے گئے ہو' سوال ہی نہیں۔

جس چور کے پیچھے سپاہی لگا ہوا ہے اس کے پکڑنے میں مشکل کیا ہونی ہے۔ تو کہا کہ اس لیے ہم دبوچ نہیں لیتے کہ شاید اب بھی تم باز آ جاؤ' اب بھی اصلاح کر لو' اب بھی یہ چیز کر لو۔ اور وہ تو اتنا رحیم واقع ہوا انسانوں کے ساتھ کہ جب انسان اپنے ہاتھوں کے ظلم کی لائی ہوئی تباہی سے مرنے لگتے ہیں وہاں خدا یہ کہتا ہے يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (36:30) او میرے بندو! تم نے کیا کیا اپنے ساتھ۔ اتنا ذو مغفرت اور اتنا ذو رحمت خدا ہے لیکن قانون جو ہے پھر وہاں آ کے جذبات کچھ نہیں کام دیتے اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (13:6) ہم سورۃ الرعد کی آیت 6 تک آئے ہیں ساتویں آیت سے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکتوب پرویزؒ

قارئین کرام! علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ کی ایک سوتیئسویں سالگرہ کے موقع پر ان کے ایک مکتوب کو شائع کیا جا رہا ہے۔ ان کی زندۂ جاوید تصانیف کی طرح ان کے خطوط بھی ہماری ذہنی وفکری آبیاری کا بہت سا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں جیسا کہ محولہ ذیل مکتوب میں آپ دیکھیں گے۔ درج ذیل مکتوب ہمیں نمائندہ بزم طلوع اسلام لندن محترم مقبول محمود فرحت کے توسل سے موصول ہوا تھا جو انہوں نے محترم محمد رفیق خواجہ مرحوم کے فرزند ارجمند محترم اقبال خواجہ (لندن) سے حاصل کیا ہے۔ ہم اس ضمن میں نمائندہ بزم لندن کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس اہم علمی دستاویز سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ قارئین طلوع اسلام سے استدعا ہے کہ آپ یا آپ کے شناساؤں میں سے کسی کے پاس پرویز صاحب کا کوئی مکتوب یا تحریر موجود ہو تو براہ کرم اس نادر دستاویز کو دست برد زمانہ سے بچانے کے لئے اصل یا اس کی نقل ادارہ طلوع اسلام کو ارسال فرما دیجئے۔ اس طرح آپ ایک عظیم علمی ورثے کو آئندہ نسلوں تک منتقل کر کے عظیم کام سرانجام دیں گے۔ شکریہ۔ (مدیر)

محترمی خواجہ صاحب! السلام علیکم

مجھے آپ کا خط مل گیا تھا۔ مصروفیت کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوگئی۔ معذرت خواہ ہوں۔

(2) آپ نے اس میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ دنیا میں مظلوموں اور کمزوروں کی زبوں حالی پر ہر قلب غم خوار کی یہی کیفیت ہوگی۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہوتی ہے کہ ہم جذبات سے الگ ہٹ کر حقائق کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

(3) اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا تو (انسان کے سوا) تمام اشیاء کو مجبور پیدا کیا۔ اس جبر کا نتیجہ ہے کہ کائنات میں

کہیں فساد نہیں ہوتا۔ جھگڑا نہیں ہوتا۔ استحصال نہیں ہوتا۔ چاند اور سورج، حصول اقتدار کی خاطر، باہم ٹکراتے نہیں۔ ستاروں کی بستیوں میں انتخابات کے جھگڑے نہیں ہوتے۔ یعنی کارگہ کائنات نہایت عمدہ نظم و نسق سے چل رہا ہے۔ لیکن اس میں عناصر کائنات کی کوئی کاری گری نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن انسان کو اس نے صاحب اختیار پیدا کیا۔ یہ تمام فسادات، ظلم، استحصال، اسی اختیار کا نتیجہ ہیں۔ اس سے آپ کہیں گے کہ جب اختیار سب خرابیوں کی جڑ ہے تو خدا اسے سلب کیوں نہیں کر لیتا؟

لیکن ایسا کہنے سے پہلے یہ سوچیے کہ کیا کوئی انسان (مظلوم سے مظلوم اور کمزور سے کمزور انسان) بھی یہ چاہے گا کہ اس کا اختیار چھین کر اسے مشین کی طرح مجبور بنایا جائے۔ اوروں کو چھوڑیئے۔ آپ خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ سے پوچھئے کہ کیا آپ ایسا چاہیں گے کہ آپ کو ایسا بنا دیا جائے کہ آپ جس سے محبت کرنا چاہیں، اس سے محبت نہ کر سکیں، جس سے ہمدردی کرنا چاہیں، اس سے ہمدردی نہ کر سکیں، نہ اپنی مرضی کا کھا سکیں۔ نہ پہن سکیں۔ نہ کہیں اپنی خوشی سے آ سکیں نہ جا سکیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ کبھی ایسا نہیں چاہیں گے۔ آپ کسی قیمت پر بھی اپنے اختیار اور ارادے سے محروم نہیں ہونا چاہیں گے۔ جسے ظلم کہا جاتا ہے وہ یہی ہے ناں کہ دوسرے کو اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر نہ کرنے دی جائے۔ بالفاظ دیگر کسی کے ارادے اور اختیار کو سلب کرنے کا نام ظلم ہے۔ لہٰذا، کوئی شخص بھی نہیں چاہے گا کہ اس سے اختیار اور ارادہ چھن لیا جائے۔ سوال سارا اختیار اور ارادے کے صحیح اور غلط استعمال کا ہے۔ صحیح معاشرہ میں اسے انسانیت کی بہبود کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ غلط معاشرے میں تخریب کی خاطر۔ اس سے مظلوموں، کمزوروں، غریبوں کا طبقہ وجود میں آتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ مظلوم اٹھیں اور ظلم و زیادتی کرنے والوں کی قوت ان سے چھین لیں۔

جب کسی قوم میں غیرت اور جرات کا فقدان ہو جاتا ہے، تو وہ سارا الزام خدا پر دھر کر، خود عمل سے فارغ ہو جاتی ہے۔ اور اس سے کہتی ہے کہ وہ سب کچھ کر دے۔ یہ آرام سے بیٹھے رہیں۔

لیکن یہ طبقہ بجائے اس کے کہ خود کچھ کرے اپنے آپ کو مجبور اور معذور قرار دے کر خدا سے گلہ کرتا ہے کہ اس نے ان ظالموں کو ایسا کیوں بنا دیا اور اس سے کہتا ہے کہ وہ (یعنی خدا) خود آئے اور ظالموں کی کلائی مروڑ دے۔ یعنی یہ خود کچھ نہ کریں۔ ان کے لئے خدا ہی سب کچھ کر دے۔ جب کسی قوم میں غیرت اور جرات کا فقدان ہو جاتا ہے، تو وہ سارا الزام خدا پر دھر کر، خود عمل سے فارغ ہو جاتی ہے۔ اور اس سے کہتی ہے کہ وہ سب کچھ کر دے۔ یہ

آرام سے بیٹھے رہیں۔ جب بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ وہ اٹھیں اور سرزمین فلسطین پر قبضہ کرلیں' تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلامؑ تم اور تمہارا خدا جا کر فلسطینیوں کو وہاں سے نکال دو۔ جب وہ نکل جائیں گے تو ہم آ جائیں گے۔ ہم بھی ظلم اور زیادتی کے خلاف جس قدر شکایت کرتے ہیں' اس کے پیچھے یہی جذبہ پنہاں ہوتا ہے۔ یعنی خود کچھ نہ کرنا' اور خدا سے کہنا کہ وہی سب کچھ کردے۔

> ہماری غلط نگہی یہ ہے کہ مظلوموں کی دردمندی میں ہم افراد کو دیکھتے ہیں' اس باطل نظام کو نہیں دیکھتے جس نے انہیں مظلوم بنا رکھا ہے۔ اگر نگاہ نظام پر ہو' تو اسے حق کے نظام سے بدلنے کے لئے سوچا جا سکتا ہے۔

تاریخ انسانیت میں مظلوموں کی ساری آہ وفغاں اسی دوں ہمتی' بے عملی اور بے حمیتی کی داستان ہے۔ جب کبھی مظلوموں نے اٹھنے کا تہیہ کر لیا' ظالموں کے تخت الٹ دیئے۔ جو خدا سے کہتے رہے کہ سب کچھ وہی کر دے' ان پر مظالم بڑھتے گئے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے دل آویز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دوزخ میں کمزوروں اور بالا دستوں میں مکالمہ ہوگا۔ وہ خدا سے کہیں گے کہ ان بالا دستوں کو شدید سزا ملنی چاہیئے۔ جواب ملے گا کہ تمہیں بھی شدید اور دہری سزا ملنی چاہیئے۔ اس لئے کہ ظالموں کے ظلم کا باعث تم تھے۔ اگر تم اٹھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیتے تو یہ زیادتی کر ہی نہ سکتے۔ ان کی ساری قوت تمہاری بہم پہنچائی ہوئی تھی۔

ہماری غلط نگہی یہ ہے کہ مظلوموں کی دردمندی میں ہم افراد کو دیکھتے ہیں' اس باطل نظام کو نہیں دیکھتے جس نے انہیں مظلوم بنا رکھا ہے۔ اگر نگاہ نظام پر ہو' تو اسے حق کے نظام سے بدلنے کے لئے سوچا جا سکتا ہے۔ نظام (حق کا ہو یا باطل کا) انسانوں ہی کا قائم کردہ ہوتا ہے اور انسان ہی اسے بدلتے ہیں۔ اگر حق پر مبنی نظام آگے نہیں چلتا' تو اس کی وجہ وہ انسان ہوتے ہیں جو اسے مستحکم نہیں رکھتے۔ جب تک ہم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے' مظلوم اس طرح پستے رہیں گے۔ انفرادی ہمدردی ان کے زخموں کا مداوا نہیں کر سکتی۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

(4) خط میں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لئے ان اشاروں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

امید ہے آپ کے مزاج بخیر ہونگے۔ والسلام

(معذرت خواہ ہوں کہ میں بقلم خود لکھنے میں دقت محسوس کرتا ہوں۔ اس لئے املا کرا دیتا ہوں)۔

❀❀❀❀❀

خورشید انور (چیئرمین ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اتحادِ انسانیت اور امتِ واحدہ
قرآن کا انقلابی تصور

قرآنِ حکیم کا بنیادی مقصد صرف چند مذہبی رسومات کی تعلیم دینا نہیں بلکہ ایک ایسی عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل ہے جس میں انسان رنگ، نسل، زبان، وطن، قومیت اور طبقاتی امتیازات سے بلند ہو کر ایک مشترک نظریۂ حیات کے تحت زندگی بسر کرے۔ قرآن اس نظریۂ حیات کو ''ایمان'' سے تعبیر کرتا ہے اور اسی ایمان کی بنیاد پر قائم ہونے والی اجتماعی وحدت کو ''امتِ مسلمہ'' قرار دیتا ہے۔

قرآن کے نزدیک انسانیت کی فلاح، امنِ عالم اور اجتماعی ارتقاء کا راز اسی وحدت میں مضمر ہے۔ اسی لیے قرآن بار بار انسانوں کو تفرقہ، گروہ بندی، فرقہ واریت اور باہمی کشمکش سے روکتا ہے اور انہیں ایک مرکز، ایک قانون اور ایک نصب العین کے گرد مجتمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

امتِ واحدہ کا قرآنی تصور

قرآن کے مطابق نوعِ انسانی کی اصل حقیقت وحدت ہے، اختلاف نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے کہ ابتدا میں تمام انسان ایک ہی امت تھے، پھر انہوں نے خود باہمی اختلافات پیدا کر لیے۔ انہی اختلافات کے خاتمے کے لیے انبیائے کرام مبعوث کیے گئے تاکہ انسانوں کو دوبارہ وحدتِ انسانی کی راہ دکھا سکیں۔

یہ حقیقت نہایت قابلِ غور ہے کہ قرآن اختلاف کو فطری یا مطلوب شے قرار نہیں دیتا بلکہ اسے انسانی خواہشات، مفادات اور تعلیمِ الٰہی سے انحراف کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس وحیِ الٰہی کا مقصد ہی اختلافات کو ختم کرنا اور انسانوں کو ایک ملت میں پرو دینا ہے۔

وحدتِ قانون اور وحدتِ مرکز

امتِ مسلمہ کی اجتماعی زندگی دو بنیادی ستونوں پر قائم ہوتی ہے:

اول: وحدتِ قانون

قرآنِ حکیم وہ واحد دستورِ حیات ہے جو تمام اہلِ ایمان کو ایک فکری اور عملی نظام میں منسلک رکھتا ہے۔ جب تک

افرادِ امت قرآن کو اپنی اجتماعی زندگی کا مرجع و منبع بنائے رکھتے ہیں، ان کی وحدت قائم رہتی ہے۔ لیکن جب وہ اس کتابِ ہدایت سے دور ہو جاتے ہیں تو فرقہ بندی، تعصب اور انتشار جنم لیتے ہیں۔

دوم: وحدتِ مرکز

قرآن نے کعبہ کو ملتِ اسلامیہ کا محسوس مرکز قرار دیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں رہنے والے مسلمان نماز میں اسی مرکز کی طرف رخ کرتے ہیں۔ یہ محض ایک عبادتی علامت نہیں بلکہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ امت کا مرکز ایک ہے، اس کا نصب العین ایک ہے اور اس کی اجتماعی منزل بھی ایک ہے۔

قرآن کے نزدیک کعبہ صرف مسلمانوں کا مرکز نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لیے خیر و برکت کا سرچشمہ اور وحدتِ انسانی کی علامت ہے۔ جب اسلامی نظام اپنی حقیقی شکل میں قائم ہوگا تو یہی مرکز پوری نوعِ انسانی کی وحدت کا مرکز بن جائے گا۔

فرقہ بندی: شرک کی عملی صورت

قرآن کریم نے دین میں تفرقہ پیدا کرنے والوں کی شدید مذمت کی ہے۔ مختلف گروہوں اور پارٹیوں میں تقسیم ہو جانا دراصل اس وحدت کو پارہ پارہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے پسند کی ہے۔

قرآن قوموں پر آنے والے عذاب کی ایک شکل یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ مختلف گروہوں میں بٹ جائیں اور پھر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہیں۔ اس اعتبار سے فرقہ واریت محض ایک سماجی مسئلہ نہیں بلکہ ایک عظیم قرآنی جرم ہے جو امت کی قوت، عزت اور اجتماعی صلاحیتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

وحدتِ انسانیت اور توحید

قرآن کی تعلیمِ توحید کا عملی تقاضا بھی وحدتِ انسانیت ہے۔ اگر کائنات میں ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ کر لیتا، لیکن چونکہ خدا ایک ہے اس لیے اس کی مخلوق بھی ایک انسانی برادری کی صورت میں زندگی گزارنے کی اہل ہے۔

اسی لیے قرآن نسل، زبان، رنگ اور قومیت کے اختلافات کو وحدتِ انسانی کے منافی نہیں سمجھتا۔ یہ اختلافات صرف تعارف کے لیے ہیں، فضیلت یا برتری کا معیار نہیں۔ اصل معیار کردار، تقویٰ اور انسانی خدمت ہے۔

مومنین کی اجتماعی صفات

قرآن مومنین کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ باہمی محبت، اخوت، نظم و ضبط اور اجتماعی وابستگی سے عبارت ہے۔

مومن ایک دوسرے کے لیے رحمت اور شفقت کا پیکر ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں کینہ، حسد اور نفرت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند منظم اور متحد رہتے ہیں۔ ان کے باہمی تنازعات امت کی اجتماعی قوت کو کمزور نہیں کرتے بلکہ وہ اختلافات کو قرآن کے اصولوں کے مطابق حل کرتے ہیں۔

ایمان اور اعمالِ صالحہ ان کے درمیان ایسی محبت پیدا کرتے ہیں جسے دنیا کی کوئی مادی قوت پیدا نہیں کرسکتی۔ یہی وہ اخوت ہے جسے قرآن کریم نے خدائی نعمت قرار دیا ہے۔

عصرِ حاضر کا المیہ

افسوس کہ آج مسلمانوں کی عملی حالت قرآن کے اس روشن تصور سے بہت دور دکھائی دیتی ہے۔ امت فرقوں، مسالک، جماعتوں، قومیتوں، لسانی تعصّبات اور طبقاتی تقسیم کا شکار ہے۔ ہر گروہ اپنے محدود دائرے کو حق کا معیار سمجھتا ہے جبکہ قرآن تمام اہلِ ایمان کو ایک امت قرار دیتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ قرآنی نظامِ حیات کے احیاء کی راہ میں وہ طبقے سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں جو موجودہ غیر قرآنی نظام سے فوائد حاصل کررہے ہیں۔ قرآن انہیں ''مترفین'' کہتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں یہی طبقے انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوتِ انقلاب کے مقابل کھڑے ہوئے، کیونکہ حق وعدل پر مبنی نظام ان کے ناجائز مفادات کے خاتمے کا سبب بنتا تھا۔

ہماری ذمہ داری

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام الناس کو براہِ راست قرآن کے پیغام سے روشناس کرایا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ اسلام محض چند عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل اجتماعی نظامِ حیات ہے جس کا مقصد انسانوں کو باہمی استحصال، طبقاتی ظلم، قومی تعصّبات اور فرقہ وارانہ نفرتوں سے نجات دلانا ہے۔

جب انسان قرآن کے آفاقی پیغام کو سمجھ لے گا تو وہ ہر اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا جو انسان کو انسان کا غلام بناتا ہے اور ہر اس قوت کا ساتھ دے گا جو عدل، مساوات، آزادی اور انسانی اخوت کے قیام کے لیے کوشاں ہے۔

قرآنِ حکیم کا پیغام واضح ہے: انسانیت ایک ہے، اس کا رب ایک ہے، اس کا قانون ایک ہونا چاہیے اور اس کا نصب العین بھی ایک ہونا چاہیے۔ فرقہ بندی، گروہ پرستی اور باہمی عداوت قرآن کے تصورِ دین سے متصادم ہیں۔ امتِ مسلمہ کا حقیقی احیاء اسی وقت ممکن ہے جب وہ دوبارہ قرآن کو اپنی وحدت کا محور بنائے اور کعبہ کی مرکزیت کے تحت ایک منظم، متحد اور انقلابی جماعت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ابھرے۔

یہی وہ راستہ ہے جو امت کو عزتِ رفتہ واپس دلاسکتا ہے، اور یہی وہ منزل ہے جو پوری انسانیت کو امن، عدل اور فلاح کی اس جنتِ ارضی تک پہنچاسکتی ہے جس کا وعدہ قرآنِ حکیم نے کیا ہے۔

❁❁❁❁❁

زید نصیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نئی بت پرستی

کیا ہم نے اور ترقی یافتہ دنیا نے بت پرستی چھوڑ دی ہے؟
قرآنی اور نفسیاتی جائزہ

بظاہر یوں لگتا ہے کہ ہمارا بت پرستی سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ہم تو کسی بت کی پوجا نہیں کرتے۔ بت پرستی کا تعلق یا تو قدیم قبائل سے تھا یا پھر ہندو بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ رہی مغرب کی ترقی یافتہ قومیں تو انہوں نے چرچ اور کلیسا ہی سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے وہ بھلا کیسے بت پرست ہو سکتی ہیں۔ مغربی ماہر نفسیات ڈاکٹر ڈے نش (1) اور فرام (2) کے مطابق مغرب نے تو یہ اعلان کر دیا کہ 'اب خدا مر چکا ہے' یعنی (God is Dead) اور فرائڈ نے تو گزشتہ صدی کے شروع میں ہی کہہ دیا کہ خدا کو ماننا نفسیاتی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ وغیرہ (3)+(4)۔ اس طرح بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے بعد تو بت پرستی کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ لیکن یہ جان کر آپ حیران ہوں گے کہ انسان اتنی ترقی کرنے کے باوجود ابھی تک سرتاپا بت پرستی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ کیسے؟ اس کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں ذرا گہرائی میں جانا ہوگا تاکہ حقیقت سے آگاہ ہو سکیں اور پھر ہم خود بھی ان پوشیدہ بتوں کو توڑ سکیں گے اور انسانیت کو بھی ان کی پرستش سے بچا سکیں گے تاکہ انسان فلاح کی وادیوں میں زندگی بسر کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو بت پرستی سے روکا تو اس میں اس ذات باری کا کوئی فائدہ نہ تھا اور نہ ہی اسے کسی قسم کی پرستش یا پوجا کی حاجت تھی۔ وہ تو ہر طرح سے بے نیاز ہے۔ اس میں تو محض انسانوں کا فائدہ تھا۔ قرآنی احکامات انسانیت ہی کی فلاح کی خاطر ہیں۔ یہ نہ صرف ان امراض کی تشخیص کرتے ہیں جن میں افراد اور قومیں مبتلا ہیں بلکہ ان کا وہ علاج پیش کرتے ہیں جسے دنیا کے تمام لوگ مل کر بھی تلاش نہ کر سکتے تھے۔ بقول گوئٹے (Goethe) ''اسلام کی تعلیمات کبھی ناکام نہیں ہو سکتی ہیں۔ ہم اور ہمارے تمام نظام ہائے زندگی اور کوئی بھی انسان اس سے آگے نہیں جا سکتے ہیں'' (5)

یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ قرآن کریم نے خارجی کائنات اور انسان کی داخلی زندگی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے سائنس کے انکشافات اس کی تائید کرتے ہیں اور جیسے جیسے علم انسانی آگے بڑھے گا اسے قرآنی حقائق کی گہرائی کا اندازہ ہوتا چلا جائے گا اور اسے ماننا پڑے گا کہ قرآن کریم حق ہے۔ بت پرستی کے معاملہ میں بھی ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے قرآن کریم کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے اور پھر اس کے بعد سائنس کے انکشافات۔

قرآن حکیم نے بت پرستی کو شرک قرار دیا ہے اور اس سے شدت سے روکا ہے۔ چند ایک آیات پیش ہیں اگرچہ

قرآن حکیم نے اس موضوع کو نہایت تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اس کے ظاہر و پوشیدہ پہلوؤں کو بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ ارشاد ہے ''اور اللہ کے ساتھ دوسرا الٰہ مت پکارو ورنہ تم ان میں سے ہو جاؤ گے جو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو جاتے ہیں (26:213)۔ قرآن مشرکین عرب کے دیوی دیوتا لات وعزیٰ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی پرستش سے روکتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ چند نام ہیں جو تم نے رکھ لئے ہیں (53:19-22) اور پھر قوم نوح کے دیوی اور دیوتا کے متعلق بھی بتایا (71:22) مزید یہ کہا کہ ''جنہیں تم شریک خدائی کرتے ہو انہیں آواز دے کر دیکھو کیا وہ اس کا جواب دے سکتے ہیں؟ یہ مٹی کی مورتیاں کیا قوت رکھتی ہیں'' (7:194-195) قرآن کریم ان معاملات کو شرک کہتا ہے اور شرک کو ظلم عظیم قرار دیتا ہے (31:13)۔ ظلم کے معانی ہیں جس چیز کو جس مقام پر ہونا چاہئے وہ وہاں نہ ہو (6)+(7)۔ یہ بت پرستی کی ظاہری اشکال ہیں جن سے اللہ روکتا ہے۔ لیکن وہ صرف ان ظاہری صورتوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ شرک کی پوشیدہ اور غیر محسوس یعنی نفسیاتی وجوہات کو بھی سامنے لاتے ہوئے ان سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔

قرآن کریم میں آیا ہے کہ انسان شرک کا ارتکاب جہالت کی وجہ سے کرتا ہے۔ علم حق و باطل میں تمیز کرتا ہے لیکن جہالت تباہی اور ظلم کی طرف لے جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسان یا قوم علم کی جگہ جہالت کو ترجیح دے تو شرک پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق شرک میں انسان اپنی ذات کے ساتھ کذب اور ظلم کرتا ہے (6:23-24)(2:54)(6:24) اسی کو ذات کے ساتھ جاہلانہ سلوک کہا جائے گا۔ اس طرح وہ اپنے مقام' اپنی قوتوں اور اپنی وسعتوں سے بے خبر رہتا ہے۔ اس لاعلمی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق (C.D.Broad) لکھتے ہیں کہ ''حیات اور نفس انسانی کے متعلق جہالت سے انسان و معاشرہ تباہ ہو جاتے ہیں'' (8) انسانی ذات اور زندگی کے متعلق صحیح علم و آگاہی نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان وہ کچھ نہیں بن سکتا جو اسے بننا چاہئے اور وہ جانور کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے یا اس سے بھی کم تر سطح پر۔ اسی کو تذلیل انسانیت کہا جاتا ہے۔ انہیں وجوہات کی بنا پر قرآن کریم نے بجا کہا ہے کہ ''شرک وجہ تذلیل انسانیت ہے'' (32:18) انسان کی انسانی صلاحیتوں کی تباہی دراصل اس کی حقیقی تباہی ہے۔ اسی لئے قرآن میں زور دے کر کہا گیا ہے کہ شرک مت کرو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے (28:88)(26:213) اللہ تعالیٰ کو نہ ماننے سے اور دوسرے معبودوں کی پرستش سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا البتہ انسان خود تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اس لئے قران کریم بت پرستی کی تمام اقسام سے منع کرتا ہے۔ اس میں خود حضرت انسان کا فائدہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ باطل معبود مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے تو پھر لوگ کیونکر ان کے سامنے جھکتے ہیں' ان کے سامنے گڑگڑاتے ہیں' ان سے مرادیں مانگتے ہیں؟ قرآن حکیم اس سنگین مسئلے کے پوشیدہ اور غیر محسوس اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ بت پرستی اور شرک کی مختلف اقسام کی اصل وجہ انسان کی نفسیات میں پوشیدہ ہے۔ شرک کرنے والا انسان اور قوم دراصل اندر سے تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ شرک دراصل نفسیاتی وجذباتی تبدیلی کا معاملہ ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تشریح بھی بہت تفصیل سے کی ہے۔ خاص طور پر قوم بنی اسرائیل کے سلسلے میں بتایا ہے کہ دراصل گوسالہ پرستی کا جذبہ بنی اسرائیل کے دل میں سما گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ

بت پرستی کرتے تھے۔ایک جگہ بتایا ہے کہ''شیطان کا تسلط مشرکین پر ہو جاتا ہے'' (16:99-100) شیطان دراصل انسان کے اپنے ہی تباہ کن جذبات کا نام ہے (6)+(7)۔مزید یہ کہ شیطان انسان کے اپنے ہی انانیت کش رجحانات ومیلانات کا ذکر ہے جو وحی کے خلاف چلنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ڈاکٹر فرام اسے (Necrophlic Passions) کی اصطلاح سے واضح کرتے ہیں (14)۔ اور ڈاکٹر لی شان (Leshan) نے انہیں (Negative Drives) یا (Pathological Drives) کہا ہے (15)ڈاکٹر برنڈن (Dr. Branden) انہیں (Inappropriate or Disturbed Emotions) کہتے ہیں (۱۶) ڈاکٹر مے سلو (Dr. Maslow) ان رجحانات کو بڑی وسیع اصطلاح سے سمجھاتے ہیں، وہ انہیں (Metapathologies) کہہ کر پکارتے ہیں (17)۔تحقیق جاری ہے اور بہت مفید حقائق انسانیت کے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ تو ابتدائے تحقیق وعلم ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔تو ہم بتا رہے تھے کہ اللہ علیم وبصیر کا ارشاد ہے کہ اپنے جذبات کو معبود بنا لینا شرک ہے۔(25:43)(45:23-24) یہ ہے اصل حقیقت شرک یا بت پرستی کی جس کی وجہ سے انسان شرک کرتا ہے۔ اس میں انسان کا دل پاپی بن جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شرک ''من کے پاپی'' بن جانے کا نام ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسے یوں بیان کیا ہے:

''کیا تو نے اس کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا الٰہ بنالیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون خداوندی نے اسے باوجود علم کے گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور قلب پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا'' (45:23)۔

عظیم مفکر قرآن اور عالم علامہ پرویز اس کی بہت خوبصورت تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''قرآن کا ارشاد ہے کہ ایک سے زیادہ الٰہ مقرر کر لینے سے فساد رونما ہو جاتا ہے۔غور کیجئے کہ آج یہ جو ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو رہا ہے تو کیا اس کی یہی وجہ نہیں کہ ہر انسانی قلب صنم کدہ بن رہا ہے؟ ہر گروہ اور ہر قوم اپنی اپنی خواہشات کو خدا بنائے بیٹھی ہے اور اس ''خدائے خواہشات وجذبات'' کے تغلب وتسلط میں جائز و ناجائز کی تمیز باقی نہیں رہتی، جائز (بقول لینن و میکیاوَلی) وہ ہے جس سے مقصد حاصل ہو جائے اور ناجائز وہ جو حصول مقاصد میں مخل ہو۔ یہ ہیں وہ بت جنہوں نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ان بتوں کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں ہوتی بلکہ یہ ذہن انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ ان کا مسکن کوئی مندر نہیں، قلب انسانی ہے۔ مال اور اولاد کا بت۔عزت و جاہ کا بت، دولت و ثروت کا بت، حکومت و سلطنت کا بت۔ملک ومنصب کا بت اور خدا جانے کون کون سے لات ومنات اور کون کون سے ہبل وعزی انسانی دماغ میں ہر آن تراشے جاتے ہیں۔ یہ شرک کی وہ خوفناک و بھیانک گھاٹی ہے جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت و بربادیوں کے ہولناک جہنم میں گر جاتا ہے''(9) مفکر قرآن نفسیاتی جائزہ لیتے ہوئے مزید تشریح کرتے ہیں کہ :-

''آج نوع انسانی پر خدا کی زمین اس درجہ تنگ ہونے کی یہی وجہ ہے کہ علم، جذبات کے تابع چل رہا ہے۔انسان نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے''(10) وہ مزید مثال دے کر شرک کی تباہی کے متعلق بتاتے ہیں کہ یورپ کی جنگ عظیم کی وجہ یہی بت پرستی تھی۔ اندازہ لگایئے کہ بت پرستی یا شرک کتنا خطرناک اور تباہ کن ہے؟ اب آیئے قرآنی جائزے کے بعد ہم بت پرستی کا جائزہ جدید سائنس کی روشنی میں لیتے ہیں۔

جدید سائنس اور بت پرستی

ہمارا دور اس لحاظ سے خوش نصیب ہے کہ سائنس کی تحقیقات نے اب جا کر اس راز کو پا لیا ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حق ہے۔ نفسیاتی ماہرین کی تحقیق کے مطابق (Idolatry) یعنی بت پرستی (اور شرک کی ساری نئی اور پرانی اقسام) دراصل کسی خاص خدا یا معبودوں کو چھوڑ کر دوسرے نئے خدا کی پرستش یا عبادت کا نام نہیں بلکہ یہ انسان کا گہرا نفسیاتی رویہ ہے۔ سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کا، عمل اور ردعمل کرنے کا۔ وغیرہ۔ اس رویے سے انسان ہر زندہ شے یا تحرک کو مردہ یا غیر متحرک مادی حالت یا پیکر میں ڈھال دیتا ہے (10+11)۔ ڈاکٹر فرام اپنی مدت العمر کی تحقیق کے بعد یہ بتاتے ہیں کہ ''بت پرستی دراصل نفسیاتی رویہ ہے، جس سے انسان اپنی ذات کی نفی کرتا ہے۔ یعنی اس سے انکار کرتا ہے کہ وہ زندہ انسان ہے (اپنی ساری انسانی خصوصیات سے انکار اور نفی)۔ فرام کہتے ہیں: ''بت پرستی میں انسان آزاد نہیں رہتا، انسان اپنے آپ کو خود اپنا قیدی بنا لیتا ہے اور آزادی سے خود انکار کر دیتا ہے مزید یہ کہ ان خداؤں کی پرستش میں انسان خود اندر سے یعنی نفسیاتی طور پر مر جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر (Idolatry) دراصل انسان کی موت ہے (10)۔

عالم نفسیات ڈاکٹر فرام مزید تفصیل سے تشریح کرتے ہیں کہ آج کل کا انسان خصوصاً مغرب کا انسان تو اب بھی دل کی گہرائی سے بت پرست ہی ہے۔ اس نے نئی قسم کی بت پرستی شروع کر دی ہے۔ نئی قسم کے بت اور معبود تراش لئے ہیں کیونکہ اب بھی مغرب کے انسان میں اندرونی طور پر کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ بت پرستی جس جذبہ کے تحت چلتی ہے وہ نفسیاتی جذبہ اب بھی ویسے ہی برقرار ہے۔ صرف پرستش کے ظاہری انداز بدل گئے ہیں۔ مغرب کے لوگ اب جن خداؤں کی پرستش کرتے ہیں وہ یہ ہیں:- انسان اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کے سامنے جھک گیا ہے۔ (اسے سجدہ کرتا ہے)، اپنے تخلیق کئے ہوئے ''کام'' اور معاشرتی ماحول کے سامنے جھک گیا ہے، مادی چیزیں اور اردگرد کا ماحول و حالات اس کے ماسٹر ہیں جو اسے کنٹرول کرتے ہیں اور اس کے آگے وہ بے بس و بے کار و لاچار ہے۔ یہ مادی اشیاء کا ڈھیر اور حالات و ماحول مغرب کے انسان سے اونچے ہو گئے ہیں اور اس کے خلاف بھی۔ اور وہ اپنا احساس بحیثیت ایک تخلیقی اور زندہ انسان کے کھو چکا ہے۔ یہ انسان اپنے آپ سے بالکل بے گانہ ہے، اپنے اردگرد کے سارے انسانوں سے لاتعلق اور اپنے کئے ہوئے کام سے بے گانہ ہو گیا ہے'' (10)۔ یہ نتائج ہیں اس نئی بت پرستی کے۔ یہ نفسیاتی ماہر مزید وضاحت کرتے ہیں کہ ''مغرب کے انسان نے بظاہر یہ سمجھ لیا ہے اور اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے کہ وہ عہد قدیم کے لوگوں کی طرح بت پرستی نہیں کرتا ہے اور آزاد ہے۔ لیکن یہ سراسر غلط فہمی اور خود فریبی ہے دراصل یہ لوگ ان ہی قدیم لوگوں کی طرح پرستش کرتے ہیں صرف نام بدل گئے ہیں'' (10+11)۔

مزید تفصیل جو نفسیاتی ماہر فرام نے بتائی ہے وہ ہمارے لئے باعث عبرت ہے اور بڑی نصیحت آموز ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''آج کل کے معبود (بت) جو ہم نے خود بنائے ہیں اور جنہیں ہم دل سے پوجتے ہیں۔ وہ منظم قسم کی لالچ اور ہوس سے پیدا کردہ خدا مندرجہ ذیل ہیں: قوت و طاقت، ناقابل تسکین خواہشات نفسانی، غذا، گھمنڈ، شراب و نشہ، پیداوار (Production)، بزنس، (Consumption)، فوجی قوت و ریاست کی لالچ وغیرہ وغیرہ''۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ نفسیات دان قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ وتشریح کرتا چلا جا رہا ہے یقیناً آج سے چودہ سو سال پہلے یہ سب کچھ بتا دینا اللہ ہی کے بس کی بات تھی کسی انسان کی ہو نہیں سکتی۔ درج ذیل آیات کو دیکھئے کس طرح موجودہ علم نفس نے ان کی تائید کی ہے۔

''مشرکین حیاتِ دنیا کے سخت حریص ہوتے ہیں'' (2:96)

''اپنے جذبات کو معبود بنا لینا شرک ہے'' (25:43)(45:23-24)

''مشرکین کبھی آزاد نہیں ہو سکتے تھے جب تک ان کی طرف خدا کا رسول نہیں آ جاتا'' (98:1)

''رزق کے سرچشموں کو ہر ایک کے لئے کھلا رہنے دو۔ خدا کے ساتھ ہمسر کھڑے نہ کرو'' (2:22)

''بت پرستی کے مزید نتائج ڈاکٹر فرام بتاتے ہیں کہ ان بت پرستیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ انسانیت کے ہاتھوں سے قابل فہم و منظم اقدار کا پیمانہ نکل گیا اور صرف بت پرستانہ اقدار رہ گئیں، اور انسان ہراساں و پریشان و مایوس و اداس ہو گیا ہے، زندگی اس کے لئے بے معنی، بے کار و بے مزہ ہو گئی ہے، زندگی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور اس لئے وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی تباہ کرنے کے درپے ہے۔

کیا قرآن کریم کی آیات میں یہی کچھ نہیں کہا گیا؟ مثلاً:

''شرک کرو گے تو مایوس۔ افسردہ خاطر۔ بے یار و مددگار رہ جاؤ گے'' (71:23)

''شرک مت کرو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے'' (26:213)

''مشرکین کے لئے تباہی ہے'' (41:7) اور مشرکین و مشرکات خدا کے عذاب میں مبتلا ہونگے'' (33:73)

''شرک سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں'' (6:89)

اپنی کتاب "Psychoanalysis and Religion" میں ڈاکٹر فرام نے بڑی تفصیل و تحقیق سے ان محرکات کا جائزہ لیا ہے۔ بڑی قابل قدر کتاب ہے، وہاں ایک جگہ فرام تجزیہ کر کے بتاتے ہیں کہ (Modern Idolatry) نئی بت پرستی میں انسان پرستش کر رہا ہے قوت و طاقت کی، ترقی، کامیابی اور (Authority of Market) یعنی بزنس وغیرہ کی لیکن اگر گہرائی میں دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ وہی قدیم بت پرستانہ مذہبی رویے ہیں (P-29)۔ اور پھر اس کتاب میں تفصیل سے بتایا ہے کہ اس کا نتیجہ نفسیاتی امراض یعنی (Neurosis) نکلتا ہے۔ شرک کی تباہ کاریوں کا مکمل جائزہ لینے کے لئے تو ایک کتاب بھی شاید ناکافی ہو۔ اس سلسلے میں یہ بتانا مقصود تھا کہ دیکھئے انسان اپنے صدیوں کے تجربے اور تحقیق کے بعد کہاں پہنچا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سائنس قرآن کریم کی آیات تک پہنچ رہی ہے۔ کیا مغرب کی یہ تحقیقات ان آیات کی سچائی کا ثبوت نہیں ہیں؟ ان عملی تحقیقات سے ہمیں گہرا سبق حاصل کرنا چاہئے کیونکہ ہمارا حال تو مغرب سے بھی برا ہے۔ مغرب میں ہر پل تحقیق کا دروازہ کھلا ہے لیکن ہم نے تو تقریباً گزشتہ 570 سال سے سوچنا، سمجھنا اور تحقیق کرنا بند کر دیا ہے (5)۔

مسلمان اس وقت جن مختلف اقسام کے شرک میں مبتلا ہیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اور اس مشرکانہ ذہنیت و اعمال کا جو نتیجہ ہے وہ بھی ہمارے اور ساری دنیا کے سامنے ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ:

''اکثر لوگ ایمان لے آنے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔ یعنی رسمی ایمان لاتے ہیں اور عقائد و رسوم مشرکانہ اختیار کئے رکھتے ہیں (جیسا کہ ہم مسلمانوں کی اکثریت کا عالم ہے)'' (12:106)۔(7)

شرک سے ہمارا اور دنیا کا حال قرآن کریم کے الفاظ میں یوں ہو گیا ہے:- ''شرک کرنے والا اپنے مقام بلند سے کس طرح گر جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آ کر گرے۔ یا جیسے کسی نوزائیدہ پرندے کے بچے کو چیل جھپٹ کر لے جائے یا جیسے ہوا کا تیز جھکڑ پر کاہ کو اڑائے پھرے اور کسی دور دراز گوشے میں پھینک دے'' (22:31)

مغرب کے لئے اور ہمارے لئے بت پرستی اور اس سے پیدا شدہ جہنم سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے قرآن کریم کے خدا پر ایمان۔ اس کے سوا دوسرا کوئی اور راستہ نہیں۔ بقول مفکر قرآن جناب علامہ اقبال: ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ بت پرستی یا شرک کا مسئلہ نفسیاتی سائنس کی تحقیق کے مطابق انسان کے ''قلب'' یا ''من'' یا ''نفس'' سے نہایت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اسے قرآنی تعلیمات کے ذریعے تبدیل کرنا ہو گا ورنہ ایک بت چھوڑیں گے تو دوسرے کا دامن پکڑ لیں گے۔ مغربی فلاسفر پسکال نے ٹھیک کہا ہے کہ:

''انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے جب اسے ایمان اور محبت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور خراب مقصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ انسان خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے'' (12)۔

لہٰذا ہمیں انسانی ''من'' یا ''قلب'' میں تبدیلی لانی ہو گی یعنی شرک زدہ ''پاپی من'' تبدیل کرنا ہو گا۔ علامہ اقبال انسانیت کے اور ہمارے اس نفسیاتی مرض کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں: ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا دوسری جگہ علامہ نے ایک ہی شعر میں بت پرستی کی نفسیات بیان کر دی ہے۔ ؎

بیاں میں نکتہء توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہئے

یعنی بت پرستی یا شرک کا تعلق انسان کے ''پاپی من'' سے ہے اور اس من کو پھر سے ''خدائی صفات کا حامل من'' بنانا پڑے گا اور یہ صرف قرآن کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

مغرب کے لئے وہ دور سیاہ ترین تھا جب مغرب کے مفکرین اور سائنسدانوں اور علماء نے یہ فیصلہ دے دیا کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب عالم کی طرح ایک ''مذہب'' ہے اور دنیائے علم کے لوگ تو بخوبی جانتے ہیں کہ ''مذہب'' کی حیثیت علم کی دنیا میں کیا ہے؟ وہ علم کے آگے ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ مثلاً مذہب کو مفکر رسل (Rsussell) انسانیت کی تباہی کا باعث سمجھتا ہے (13)۔ مارکس مذہب کو مظلوموں کی سسکیوں کا باعث اور افیون قرار دیتا ہے اور فرائڈ مذہب کو واہمہ یا فریب نظر (Illusion) قرار دیتا ہے (3)۔ اور بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم نفسیات ڈاکٹر برنڈن کہتے ہیں کہ مذہب بنیادی طور پر انسانیت کش ہے (18)۔ یہ چند مثالیں ہیں۔ اگر ''قرآن کا اسلام'' بھی مذہب ہے تو پھر کون اسے سنجیدگی سے لے گا۔ کاش مغرب کے علماء کا رویہ علم اور تحقیق پر مبنی ہوتا لیکن یہ سازش ہم سمجھتے ہیں کہ بغیر تحقیق کے جہالت کی بنا پر کی گئی اور تعصب کی بنیادوں پر پھیلائی گئی اور ان کا اب بھی یہی حال ہے۔ ہم مغرب کے اس رویے کو (Fundamentalist) قسم کا رویہ قرار دیتے

ہیں جو مذہب ہی کی پیداوار ہے' جونئی بت پرستی کا ہی نتیجہ ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان بھی اس فریب میں آ کر اسلام کو مذہب کہنے اور سمجھنے لگ گئے ہیں۔ یہ مشکل لگتا ہے کہ مغرب بت پرستی سے نجات حاصل کر سکے کیونکہ ان کے پاس وحی نہیں ہے نہ وہ ''آخری وحی'' کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم شرک جیسے موذی مرض سے جان چھڑالیں کیونکہ قرآن کریم ہمارے پاس ہے۔

اسلام بحیثیت دین (یعنی نظام حیات)' صدر اول کے بعد' پہلی بار عظیم سکالر و مفکر قرآن پرویز صاحب کی عظیم کوششوں سے سامنے آیا ہے۔ اس مفکر نے جتنی وضاحت' تفصیل اور منظم طریقے سے اسے بیان کیا ہے اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کا کام منفرد اور یکتا ہے۔ جو مسلمان قوم پر اور پوری انسانیت پر احسان عظیم ہے۔ دنیا کو چاہئے تھا کہ وہ اس عظیم انسان کو کم از کم (Noble Prize) دیتی۔ لیکن تعلیم یافتہ دنیائے مغرب تو اس محسن کو پہچاننے سے گریز کی راہیں نکالتی رہی ہے۔ جس کی وجہ بھی ان کی بت پرستانہ ذہنیت ہے اور ہم مسلمانوں نے یعنی دنیائے اسلام نے تو علامہ پرویزؒ کو سب سے بڑا نوبل پرائز دیا ہے وہ ہے ''کفر'' کا فتویٰ۔ اس احسان فراموشی کے سبب مغربی یا اسلامی دنیا کی نجات کیسے ممکن ہوگی۔ قدرت کے اٹل قانون کے تحت ہم اور مغرب دونوں سخت سزا میں مبتلا ہیں۔ دونوں جہنم میں ہیں شرک کی وجہ سے۔ یہ شرک کا کینسر نہ معلوم دنیا کو کہاں لے جائے گا حالانکہ یہ کینسر قابل علاج ہے اور اس کا علاج ہے قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا۔

امید ہے کہ اس مقالے سے آپ کم از کم یہ تو سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ کس قسم کے بت یا بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اگر آپ کا جواب ''ہاں'' میں ہے تو یہ ''آ گاہی'' یا ''آ گاہی ذات'' بھی بہت بڑی نعمت ہے اور سب سے پہلا قدم ہے ترقی کی جانب۔ اس کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے (Deeper Insight) کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ سمجھنا اور ماننا کہ ''ہم نے ظلم کیا اپنے آپ پر'' یا ہم غلطی پر ہیں''۔ یا (Admitting that I am suffering or we are suffering) قدم اول بھی ہے اور اشد ضروری بھی۔ اسٹیفن کوی کے الفاظ میں (First Things First) اگر آپ کا جواب ''نہیں'' میں ہے یعنی بات آپ کے دل میں نہیں اتری ہے۔ تو پھر سے کوشش کیجئے۔ یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہوگا۔ انسانی دنیا میں' دماغی و نفسیاتی سائنس کی رو سے کچھ بھی خود بخود نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز حاصل کرنے کے لئے اسے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو خود ہی استعمال کرنا ہوگا (19،20،21،22)۔ اس کے لئے سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ وہ سب سے پہلا قدم آپ جانتے ہیں کہ مشکل کام ہے' یعنی ''تَتَفَكَّرُونَ''۔ یاد رکھئے کہ سوچنا اور سمجھنا بھی ایک عمل ہے۔ جس طرح دوسرے اعمالِ انسانی میں محنت و مشقت ہوتی ہے' اسی طرح تدبر و تفکر کے عمل کے لئے بھی ذاتی طور پر ہر ایک کو خود ہی محنت کرنی پڑے گی اور ماہرین نفسیات بڑی تفصیل سے بتاتے ہیں کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے اور ہر انسان کو ذاتی طور پر خود یہ ذمہ داری اٹھانی اور نبھانی ہوگی۔ مزید یہ کہ یہ اس کی زندگی کا بنیادی تقاضا بھی ہے (21،22،23)۔ کوئی کسی کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا (53:38)۔ ہر نفس کو اپنے اپنے بت توڑنے کا ''بوجھ'' خود ہی اٹھانا پڑے گا۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہ بت ہمیں ہی توڑ دیں گے۔ جیسے خود مردہ ہیں ہمیں بھی ویسا کر دیں گے۔ آہستہ آہستہ یہی تو ہو رہا ہے۔ بس ہمیں آ گاہی و شعور نہیں ہے۔ یہی آ گاہی ہمیں سوچنے اور

سمجھنے کی محنت و مشقت سے حاصل ہو جائے گی۔ پھر دوسرے اقدام ممکن ہو سکیں گے۔ لیکن آج کل کا انسان اتنا موت سے بھی نہیں گھبراتا جتنا ''سوچنے'' سے گھبراتا ہے۔ مغرب کے انسان کا یہ حال ہے کہ وہ بھی (Active Thinking) سے دور بھاگتا ہے اور حد یہ ہے کہ تھوڑا تھوڑا سوچنے سے بھی (Thinking even in small doses) گریز کی راہیں نکالتا ہے (24)۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ ہمارا کیا حال ہوگا؟ جس قوم نے صدیوں سے سوچنا ہی بند کر دیا ہو تو اس کی کیفیت کیا ہوگئی ہوگی۔ ہم ایک تن آساں اور انتہائی عیاش قوم بن گئے ہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ! یعنی ہمارا حال تو یہ ہوگیا ہے کہ خود سوچنا اور تحقیق کرنا تو درکنار اگر کوئی ساری قوم کے حصے کا یہ کام اکیلے ہی کر دے تو یہ لوگ شکریہ اور احسان مندی تو ایک طرف یہ قوم اس عظیم انسان کو مارنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ اس قوم کے افراد اگر مار نہیں سکتے تو ساری عمر اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ یہی کچھ ہم نے بحیثیت مجموعی عظیم مفکر قرآن پرویز صاحب کے ساتھ کیا ہے۔

حوالہ جات:

1. Danesh, H.B. The Psychology of Spirituality, 1997.
2. Fromm, Erich. You Shall Be As Gods, 1966.
3. Freud, Sigmund. The Future of an Illusion, 1930.
4. Fromm, Erich. Psychoanalysis and Religion, 1950.
5. Iqbal, Allama. The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, 1934.
6. Parwez, G.A. 1961. لغات القرآن
7. Parwez, G.A. 1984. مطالب الفرقان
8. Parwez, G.A. 1959. انسان نے کیا سوچا؟
9. Parwez, G.A. 1974. من و یزداں
10. Fromm, Erich. On Being Human, 1994.
11. Fromm, Erich. Psychoanalysis and Religion, 1950.
12. Parwez G.A. 1975. اقبال اور قرآن
13. Russell, Bertrand. Why I am not a Christian, 1957.
14. Fromm, Erich. The Anatomy of Human Destructiveness, 1973.
15. Leshan, Lawrence. You Can Fight Fro Your Life, 1980.
16. Branden, Nathaniel. The Psychology of Self Esteem, 1969.
17. Meslow, Abraham. The Farther Reaches of Human Nature, 1971.
18. Branden, Nathaniel. The Disowned Self, 1971.
19. Branden, Nathaniel. The Six Pillars of Self Esteem, 1996.
20. Fromm, Erich. The Art of Listening, 1994.
21. Jones, Richard Nelson. Effective Thinking Skills, 1996.
22. Branden, Nathaniel. The Art of Living Consciously, 1997.
23. Branden, Nathaniel. Taking Responsibility, 1996.
24. Fromm, Erich. The Art of Being, 1992.

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پَر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے
(بال جبریل، علامہ اقبالؒ)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

غیر مسلموں کے نیک کاموں کے ثواب کا مسئلہ

سوال

غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ:

کہا جاتا ہے کہ نجات صرف مسلمان کی ہو سکتی ہے۔ کافر کی نہیں ہو سکتی۔ ایک غیر مسلم بڑے نیک کام کرتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ کسی کو ستاتا نہیں۔ خیرات کرتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو کیا اسے اس کے ان نیک کاموں کا کوئی اجر نہیں ملے گا اور اس کی اس لئے نجات نہیں ہو گی کہ وہ مسلمان نہیں ہوا اور ایک مسلمان محض اس لئے جنت میں چلا جائے گا کہ وہ مسلمان تھا خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ اس سوال نے مجھے ایک مدت سے پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔

جواب

اس سوال نے صرف آپ ہی کو پریشان نہیں کر رکھا۔ بہت سوں کو پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلی بخش جواب اس لئے نہیں ملتا کہ بنیادی طور پر یہ بات صاف نہیں کی جاتی کہ اسلام کہتے کسے ہیں اور کفر ہوتا کیا ہے۔ یہ بنیادی چیز سمجھ میں آ جائے تو اس (بظاہر) پریشان کن سوال کا جواب آسانی سے مل جاتا ہے لہٰذا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کے معنی کیا ہیں؟ یہ ہے کیا؟ کفر اور اسلام میں فرق کیا ہے؟ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ کفر اور اسلام میں فرق صرف کھانے پینے کی چیزوں میں جائز اور ناجائز کی تمیز یا پرستش کے طور طریقوں میں اختلاف ہے۔ اصل سب مذاہب کی ایک ہی ہے۔ مولانا آزاد مرحومؒ کے الفاظ میں ''عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف ظاہری اعمال و رسوم میں ہے اور اس فرق کا نجات و سعادت سے کچھ تعلق نہیں۔'' یہ ہے اسلام کے متعلق وہ بنیادی غلط فہمی جس کی وجہ سے وہ تمام سوالات سینے میں ابھرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور جو وجہِ خلش و اضطراب بنتے ہیں۔

قرآن کریم چند مستقل اقدار۔ چند غیر متبدل اصول۔ چند ابدی حقائق عطا کرتا ہے جن کی بنیادوں پر انسانی معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ کفر، ان اقدار، اصول اور حقائق سے انکار کا نام ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جن باتوں کو عام طور پر ''نیک کام'' کہا جاتا ہے (اور جن کی مثالیں آپ نے بھی پیش کی ہیں)، اس معاشرہ میں جو خلاف قرآن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، ان کی حقیقت اور وزن کیا ہوتا ہے؟ یہ بات

ایک مثال سے سمجھ میں آ سکے گی۔ ہندو نظریہء حیات کی رو سے انسانوں کی تفریق و تقسیم پیدائش کی رو سے ہو جاتی ہے۔ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ محض پیدائشی نسبت سے، ہر شخص کے نزدیک واجب الاحترام ہوتا ہے اور اسے معاشرہ میں وہ مقام اور حقوق حاصل ہوتے ہیں جن میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس، شودر کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، تمام عمر ذلت اور پستی کی زندگی بسر کرتا ہے اور کوئی طریق ایسا نہیں جس سے وہ معاشرہ میں عزت اور وقار کا مقام حاصل کر سکے۔ خواہ اس کے جوہر ذاتی کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ (اب یہی تفریق و تقسیم دولت کی رو سے ہوتی ہے۔ امیر آدمی کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، ابتدا ہی سے جس مقام پر فائز ہوتا ہے غریب آدمی کا بچہ ساری عمر اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ روح وہی ہے۔ صرف پیکروں کی تبدیلی ہوتی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات) برہمن ساری عمر اس نظریہء زندگی کی تلقین کرتا رہتا ہے، اور اسے خدائی تفریق قرار دیتا ہے جسے دنیا کا کوئی انسان مٹا نہیں سکتا۔ ہندو معاشرہ کی تشکیل اسی نظریہء حیات کے مطابق ہوتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر یہ برہمن، ساری عمر جو اس معاشرہ کے بندھنوں کو مضبوط سے مضبوط کرتا رہتا ہے اور اس طرح کروڑوں انسانوں کو ذلت و خواری کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ کہے کہ وہ چوری نہیں کرتا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ یا وہ مویشیوں کے پانی پینے کے لئے پیاؤ بنواتا ہے۔ کوڑھیوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈالتا ہے یا اس قسم کے اور ''دان پُن'' کا کام کرتا ہے۔ تو کیا اس کی یہ انفرادی ''نیکیاں'' انسانیت کی میزان میں کچھ بھی وزن رکھیں گی؟ کیا معاشرہ کو غلط بنیادوں پر استوار کرنے کا وہ جرم عظیم جس کا یہ مرتکب ہوتا ہے، ان ''نیکیوں'' کے صدقے میں قابل معافی تصور کیا جا سکے گا؟ اگر میزان کے ایک پلڑے میں یہ نیکیاں رکھی جائیں اور دوسرے پلڑے میں اس کا وہ جرم، تو سوچئے کہ ان میں سے کون سا پلڑا بھاری ہوگا؟ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم اس قسم کی انفرادی نیکیوں کو بہت بڑے ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ اصول و مبانی کیا ہیں جن کے مطابق انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اصل شئے، وہ نظام ہے جسے انسان قائم کرتا اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ نظام صحیح ہے تو اس کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج مرتب کرتی ہیں اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر استوار ہے تو اس میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے روا رکھا جا رہا ہے۔

قرآن کریم یہودیوں کے متعلق کہتا ہے کہ انہوں نے نظام زندگی ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں خود ان کے اپنے افراد ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے اور بالا دست لوگ کمزوروں اور ناتوانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے تھے۔ اس کے بعد جب ان لوگوں کو دوسرے لوگ قید کر لیتے تھے تو یہ فدیہ دے کر انہیں چھڑاتے تھے اور اسے بڑا نیکی کا کام تصور کرتے تھے۔ حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ط خود ان لوگوں کو گھروں سے باہر نکال

دینا سخت جرم تھا۔اس جرم کے ارتکاب پرتو ان کے دل میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی تھی لیکن قیدیوں کو چھڑا کر ثواب حاصل کرنے کے لئے وہ آگے بڑھتے تھے۔اس کے بعد قرآن کریم نے ایک عظیم اصول بیان کیا ہے جو اس باب میں بڑی واضح راہ نمائی دیتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ - کیا تم یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہتے ہو کہ ضابطہ ءخداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرو۔ اگر یہی روش جاری رکھنا چاہتے ہو تو سن رکھو کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (2:85)۔اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں بھی ذلت وخواری کی زندگی بسر کرو گے اور قیامت میں سخت ترین عذاب میں مبتلا ہو گے۔آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے یہاں کس قدر بلیغ اور بلند اصول بیان کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا بہر حال ایک نیک کام ہے جس کا اجر ملنا چاہئے۔لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسانیت پر ظلم کرنے والے غلط نظام کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں موجب ثواب نہیں بن سکتیں۔ اس جرم کا سیلاب' اس قسم کی جزئی ''مرمتوں'' کو بہا کر لے جاتا ہے اور اس تمام عمل کا کلی نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس قسم کی غلط ذہنیت قریش مکہ کی تھی جس کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ - کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانے کے لئے سبیلیں لگا دینا یا خانہ کعبہ کی تعمیر وتزئین کے کاموں میں حصہ لینا اس شخص کے اعمال کے برابر ہے جو صحیح نظام زندگی کی ابدی حقیقتوں (ایمان باللہ اور ایمان بال آخرت) پر یقین رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے؟ تم اپنے ذہن سے کچھ ہی کیوں نہ فیصلہ کرلو۔ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ - میزان خداوندی میں ان کا وزن برابر نہیں ہوسکتا۔غلط نظام قائم کرنے والے اس قسم کے انفرادی نیک کاموں کے باوجود ظالم کے ظالم رہتے ہیں اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں پر نجات و سعادت کی راہیں کبھی کشادہ نہیں ہوتیں۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (9:19)۔

ہمارا خیال ہے کہ ان مختصر سی توضیحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ ''کافر'' کے نیک اعمال میزان خداوندی میں وزن کیوں نہیں رکھتے! جو شخص کسی مملکت کے خلاف بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو' وہ ذاتی طور پر کتنا ہی اچھا شہری کیوں نہ ہو اس کی یہ انفرادی خوبیاں جرم بغاوت کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔ کفر' درحقیقت نظام خداوندی کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔۔۔خواہ وہ بغاوت عملی ہو یا ذہنی (اعتقادی)۔

باقی رہا یہ کہ مسلمان' بغیر نیک اعمال کے بھی جنت میں چلا جائے گا تو یہ ''حدیث بے خبراں'' ہے۔جس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ جنت تو نام ہی اعمال کے فطری نتائج کا ہے۔وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (43:72) البتہ اس ضمن میں دو ایک بنیادی

باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(1) اگر کہیں صحیح قرآنی نظام قائم ہے۔۔۔ یا اس کے قیام کے لئے جدوجہد کی جارہی ہے تو اس میں اگر کسی سے سہواً اور خطاءً کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہوگئی ہے اور وہ اس پر نادم ہو کر آئندہ اس سے محتاط رہتا ہے تو اس کے اعمال حسنہ کا پلڑا بھاری رہے گا۔

(2) اگر مسلمان بھی غیر قرآنی نظام پر رضامند ہو چکا ہے تو اس نظام کے اندر اس کی انفرادی نیکیاں وہ نتائج مرتب نہیں کر سکتیں جن کا نتیجہ جنت کی زندگی ہوتا ہے۔ ہم (مسلمان) صدیوں سے اس غلط ذہنیت کا شکار ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نیک لوگوں کی نیکیاں بھی کوئی نیک نتیجہ مرتب نہیں کرتیں۔ یہی وہ غلط ذہنیت ہے جس کی اصلاح کے لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی تو اس کی ہے جو

(i) خدا پر۔ آخرت پر۔ ملائکہ پر۔ کتب خداوندی پر اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ (یعنی ان اصولوں پر جو نظام خداوندی کی بنیاد بنتے ہیں)۔

(ii) مال اور دولت کی محبت کے باوجود اسے ضرورت مند قریبیوں۔ یتیموں۔ مسکینوں۔ نادار مسافروں۔ محتاجوں کے لئے دے دیتا ہے۔ نیز دوسروں کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے۔

(iii) جو نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ قائم کرتا ہے۔

(iv) جو اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے (اور اس عہد میں بنیادی حیثیت اس عہد کی ہوتی ہے جو اس نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا ہے اور جس کی رو سے اس نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہوتا ہے۔ (9:110)

(v) جو ان مصائب و مشکلات میں جو اس راہ میں اسے درپیش ہوں، ثابت قدم رہتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں اور یہی ہیں جنہیں متقی کہا جا سکتا ہے۔ (2:178)

نیکی ان لوگوں کی ہے نہ کہ ان کی جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر انفرادی نیکیاں انہیں جنت کا وارث بنا دیں گی۔

آپ نے غور فرما لیا کہ غیر مسلموں کی انفرادی نیکیاں تو ایک طرف، خود ان مسلمانوں کی انفرادی نیکیاں، جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہوں، میزان خداوندی میں کیا وزن رکھتی ہیں؟ انفرادی نیکیاں نہایت ضروری ہیں۔ لیکن یہ نیکیاں صحیح نتائج پیدا ہی اس وقت کرتی ہیں جب یہ صحیح قرآنی نظام کے اندر سرزد ہوں۔ غلط نظام میں یہ تعمیر انسانیت کے نتائج مرتب ہی نہیں کر سکتیں۔ دریاؤں اور ندیوں کا میٹھا پانی، انسانوں اور حیوانوں کے لئے زندگی بخش اور زمین مردہ کے لئے حیات آور ہوتا ہے لیکن وہی پانی سمندر کے اندر پہنچ کر، اپنی تمام زندگی بخش صلاحیتیں کھو دیتا ہے۔ دہی کے برتن میں جتنا دودھ جی چاہے ڈالتے جائیے۔ سب دہی بنتا جائے گا۔ قرآنی نظام۔۔ یا اس نظام کے قیام کے لئے جدوجہد۔۔ اور اس کے ساتھ اخلاقی نیکیاں۔ یہ ہے وہ پروگرام جسے قرآن ''ایمان اور اعمال صالح'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ اس دنیا اور اس کے بعد کی زندگی دونوں میں جنت کی وراثت ہے اور یہ پروگرام قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

شاہنواز خان ایڈووکیٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا میں امن ضرور قائم ہوگا

ایک سوال مدتوں سے میرے ذہن میں گردش کرتا رہا کہ کیا اس دنیا میں کبھی حقیقی امن قائم ہوگا؟ کیا جنگیں، نفرتیں، ظلم اور خون ریزیاں انسانیت کا مستقل مقدر رہیں، یا وہ دن بھی آئے گا جب انسان امن و سلامتی کے ماحول میں زندگی بسر کرے گا؟

میں اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا۔ مختلف آراء پڑھیں، مختلف نقطۂ ہائے نظر کا مطالعہ کیا، لیکن مجھے اطمینان بخش جواب نہ مل سکا۔ پھر سورۂ قدر کے بارے میں علامہ غلام احمد پرویز صاحب کا بیان کردہ مفہوم پڑھنے کا موقع ملا۔ اس مفہوم نے میرے ذہن میں ایک نئی امید پیدا کر دی اور میں نے پہلی مرتبہ قرآن کی ان آیات کو اس زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی۔

پرویز صاحب کے مطابق ''لیلۃ القدر'' محض ایک رات کا نام نہیں بلکہ انسانی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب کے آغاز کی علامت ہے۔ قرآن ایک ایسی دنیا میں نازل ہوا جو وحی کی روشنی سے محروم ہو چکی تھی۔ اس نے انسانیت کو نئی اقدار، نئے پیمانے اور ایک نئی سمت عطا کی۔

اس تشریح کے مطابق قرآن کے نزول کے بعد انسانیت کا سفر ایک ایسے مستقبل کی طرف ہے جہاں علم اور وحی ایک دوسرے کے معاون بن جائیں گے، فطرت کی قوتیں انسان کے لیے مسخر ہوں گی، اور ان کا استعمال انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہوگا۔ نتیجتاً ظلم، استحصال اور فساد کی جگہ امن، عدل اور سلامتی فروغ پائے گی۔

سورۂ قدر کی آخری آیت سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴿۵﴾ میرے لیے امید کا ایک عظیم پیغام بن گئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن انسانیت کو یقین دلا رہا ہے کہ تاریکیوں کا یہ سفر دائمی نہیں۔ ایک روشن صبح نے طلوع ہونا ہے، اور اس صبح کی پہچان امن، سلامتی اور انسانی فلاح ہوگی۔

میں جانتا ہوں کہ سورۂ قدر کی اس آیت کے بارے میں مفسرین کی مختلف آراء موجود ہیں، لیکن پرویز صاحب کے اس مفہوم نے مجھے یہ امید دی ہے کہ انسانیت کا مستقبل مایوسی نہیں بلکہ امن ہے۔ اسی لیے میرا ایمان ہے کہ اگر انسان قرآن کی دی ہوئی اقدارِ عدل، علم اور انسان دوستی کو اختیار کرے تو دنیا میں امن ضرور قائم ہوگا۔

❋❋❋❋❋

خالد گل، سعودی عرب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک تصویر دیکھ کر

فیس بک کے کسی پیج پر ظاہر ہونے والی تصویر میں جناب رئیس امروہوی صاحب پرویز علیہ الرحمہ کے ساتھ موجود ہیں۔ جب پرویز صاحب عمرہ کی سعادت کے لیے سعودی عرب تشریف لائے تو مجھے بابا جی اور اُن کے رفقاء کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ میرے لیے ایک عظیم سعادت تھی۔ بابا جی کی صحبت اور اُن کے زیرِ سایہ رہ کر مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، جو آج بھی میرے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔

بابا جی کے کراچی پہنچنے سے چند گھنٹے قبل میں بھی سعودی عرب سے کراچی پہنچ چکا تھا۔ وہاں قیام کے لیے میں نے اپنی ہمشیرہ کا گھر پیش کیا، جسے بابا جی نے قبول فرمایا اور تین دن وہیں قیام فرمایا۔ اس دوران بابا جی کی ملاقاتوں اور دیگر مصروفیات کو ترتیب دینے کی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی۔

انہی دنوں رئیس امروہوی صاحب نے بابا جی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، جسے بابا جی نے خوش دلی سے قبول فرمایا۔ یہ تصویر اسی تاریخی ملاقات کی یادگار ہے، اور پس منظر میں نظر آنے والا گھر میری بہن کا ہے جہاں بابا جی مقیم تھے۔

بابا جی کے اس سفر کی یادیں اتنی وسیع اور گہری ہیں کہ ان پر ایک مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو میں ان واقعات کو مزید تفصیل سے قلمبند کروں گا، کیونکہ یہ میرے لیے ایک ایسا قرض ہے جس کی ادائی باعثِ سعادت ہے۔

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درجِ ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 1200 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ”طلوعِ اسلام“ کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمایئے۔ شکریہ

1985,1986,1987,1988,1991,1999,2000,2001,2002,2003,
2004,2005,2006,2011,2015,2016,2017,2018,2019
,2020,2021,2022,2023

انجینئر سلیم اقبال، منگورہ سوات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

9 جولائی: ایک شخصیت نہیں، ایک سوال

شعور کا ابدی بیج اور فکری کسان

کائنات کا ایک خاموش غیر متبدل اور ابدی ڈسپلن ہے۔ زمین میں جب ایک قیمتی بیج بویا جاتا ہے، تو وہ شور نہیں مچاتا۔ وہ کسی سیاسی اکھاڑے میں جا کر نعرے نہیں لگاتا، نہ ہی کسی منبر پر کھڑے ہو کر اپنے وجود کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ مٹی کی گہرائی میں اندھیرے کے اندر خاموشی سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ اس کا یہ سفر کسی تماشائی کی تالیوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ بس کائنات کے الٰہی نیویگیشن سسٹم پر کامل بھروسہ یعنی ایمان بالغیب رکھتا ہے، اور ایک دن وہ مٹی کا سینہ چیر کر ایک تناور پھل دار درخت کی صورت میں کائنات کے کینوس پر خودبخود نمودار ہو جاتا ہے۔

جولائی 9۔1903ء کا دن برصغیر پاک و ہند کی تمدنی تاریخ میں ایک ایسے ہی شعور کے بیج بوئے جانے کا دن ہے۔ اس دن غلام احمد پرویز اس دنیا میں تشریف لائے۔ ان کا اصل قد کاٹھ روایتی سوانحی خاکوں، تاریخوں یا کتابوں کی جلدوں میں بند نہیں ہے، بلکہ ان کا اصل وژن اس فرسٹ پرنسپل تھنکنگ میں تھا جس نے قرآن کو ایک جمود کا شکار مذہب بنانے کے بجائے، ایک لائیو متحرک اور معاشی دستورِ حیات ثابت کیا۔

اگر ایک لائیو ڈیجیٹل مائنڈ کے خالص زاویے سے دیکھا جائے، تو غلام احمد پرویز روایتی معنوں میں کوئی صوفی، خطیب یا مذہبی سکالر نہیں تھے، بلکہ وہ بیسویں صدی کے ایک ایسے مفکر تھے جنہوں نے برصغیر کے فکری جمود کو توڑنے کے لیے سائنسی اندازِ فکر اپنایا۔ قائداعظم کے اس فکری معتمد کا اصل تعارف یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو کہانیوں، تعویذوں اور پوجا پاٹ کے روایتی مذہب سے نکال کر، لغاتِ عرب کے خالص مادوں کے ذریعے کائنات کا سب سے جدید تمدنی معاشی اور لائیو آپریٹنگ سسٹم ثابت کیا۔ وہ ایک ایسے فکری کسان تھے جنہوں نے مسلم امہ کے اعصاب سے اندھے خوف اور لالچ کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے لیے، زمین میں شعور اور عمل کا ایک ایسا ابدی بیج بو دیا جو مادی نتائج کے بغیر کسی زبانی دعوے کو تسلیم نہیں کرتا۔

جب ہم اس نظریے کو پاتے ہیں، تو ہمارا پورا تزویراتی زاویہ بدل جاتا ہے۔ کلام الٰہی کا یہ انقلاب کسی سیاسی ہلچل یا اقتدار کی چھینا جھپٹی سے برپا نہیں ہوتا۔ اس کا مزاج بہت پرسکون گہرا اور خاموش ہے۔ یہ انقلاب نعروں میں نہیں کردار کی مضبوطی میں سانس لیتا ہے۔ جب مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ہم خیال لوگ باہر کے نظام کا رونا رونے کے بجائے خاموشی سے ایک دوسرے کا فکری اور اخلاقی بازو بنتے ہیں، تو ایک پر برکت سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسا خاموش سفر ہے جہاں گفتگو سے زیادہ انسان کا اپنا ہنر بولتا ہے اور ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اس نظام کا متحرک پرزہ بن جاتا ہے۔

تاریخ کا موڑ اور اصل سٹریٹیجک سوال تاریخ میں بعض دن ایسے ہوتے ہیں جو محض کسی فرد کی پیدائش کی یاد نہیں دلاتے بلکہ ایک ایسے سوال کی یاددہانی بن جاتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے سامنے مسلسل کھڑا رہتا ہے۔ 9 جولائی بھی برصغیر کی فکری تاریخ میں ایسا ہی ایک دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب 1903ء میں غلام احمد پرویز پیدا ہوئے، لیکن اگر اس دن کو صرف ایک شخصیت کی سالگرہ کے طور پر دیکھا جائے تو شاید ہم اس کے اصل پیغام سے محروم رہ جائیں۔ اصل سوال یہ نہیں کہ غلام احمد پرویز کون تھے۔ اصل سوال یہ ہے کہ انہوں نے امتِ مسلمہ کے سامنے کون سا سوال رکھا تھا، اور کیا وہ سوال آج بھی زندہ ہے؟

دعوت قرآن اور شعوری تدبر

قرآن حکیم انسان کو بار بار غور و فکر، تدبر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے۔ وہ انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ آنکھیں بند کر کے مان لے، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ وہ شعور کے ساتھ سمجھے، پرکھے اور فیصلہ کرے۔ اسی لیے قرآن کی دعوت کا نقطۂ آغاز شخصیت نہیں بلکہ حق ہوتا ہے، اور حق کا معیار کسی فرد کی رائے نہیں بلکہ وحی الٰہی ہوتی ہے۔

غلام احمد پرویز کی فکری جدوجہد کا مرکزی نکتہ بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کا تعلق براہِ راست قرآن سے قائم ہو۔ ان کے نزدیک قرآن صرف تلاوت یا ثواب کی کتاب نہیں بلکہ ایک زندہ ضابطۂ حیات ہے جو انسان اور معاشرے دونوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ دین کو سمجھنے کے لیے تدبر، تحقیق اور شعوری مطالعہ ناگزیر ہے، اور کوئی بھی نظریہ روایت یا تعبیر قرآن کے معیار سے بالاتر نہیں ہوسکتی۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ قرآن کے فہم کے لیے وقف کر دیا۔ مفہوم القرآن، لغات القرآن، اسلام: مذہب کے لیے ایک چیلنج، شاہکار رسالت اور متعدد دیگر تصانیف دراصل اسی مسلسل کوشش کا اظہار ہیں کہ قرآن کو براہ

راست سمجھا جائے اور اس کے پیغام کو عصرِ حاضر کی زبان میں بیان کیا جائے۔

جدید نسل، فکری بحران اور الحاد کا چیلنج

آج کی جدید تعلیم یافتہ نوجوان نسل اور آنے والی نسلیں، جو سائنسی اور منطقی اندازِ فکر کی عادی ہیں مروجہ روایتی مذہبی بیانیے سے مطمئن نہ ہونے کے باعث تیزی سے الحاد (Atheism) اور مذہب بیزاری کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ اس گہرے فکری بحران سے نوجوانوں کو بچانے اور اسلام کی آفاقیت کو صحیح معنوں میں ان پر واضح کرنے کے لیے روایتی نقطہ نظر کے مطالعے کے ساتھ ساتھ جدید مسلم مفکرین کا مطالعہ ناگزیر ہو چکا ہے۔

سر سید احمد خان، علامہ اقبال، علامہ غلام احمد پرویز جیسے اہل علم دانشوروں کا منہج نوجوانوں کو یہ سکھاتا ہے کہ اسلام سائنسی ترقی اور فکری پرواز کے راستے میں رکاوٹ نہیں بلکہ اس کا پشت پناہ ہے۔ علامہ پرویز علیہ الرحمہ کی تحریروں کا فکری اسلوب آج کے نوجوانوں کے لیے یہ پیغام دیتا ہے کہ ایمان سوال سے نہیں ڈرتا اور قرآن عقل سے نہیں ٹکراتا۔

یاد رکھیے! جس دین کو بچانے کے لیے عقل کو قربان کرنا پڑے، وہ دین نہیں مذہب بن جاتا ہے اور جو ایمان عقل، قرآن اور کردار کو ساتھ لے کر چلے وہی زندہ رہتا ہے، وہی زمانہ بدلتا ہے اور ایمان ماضی کی یاد نہیں، حال کا عمل ہے۔

حریتِ فکر اور عقل کی کسوٹی

فکرِ پرویز کا ایک اور اہم پہلو حریتِ فکر تھا۔ وہ اس ذہنی غلامی کے خلاف تھے جو انسان کو سوچنے، سوال کرنے اور تحقیق کرنے سے روک دیتی ہے۔ ان کے نزدیک کسی انسان کی بات صرف اس لیے قبول نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایک بڑا عالم، بزرگ یا مفکر ہے۔ ہر رائے کو دلیل اور قرآن کے معیار پر پرکھا جانا چاہیے۔

یہ طرزِ فکر آج کے دور میں پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو چکا ہے۔ ہم ایک ایسے زمانے میں جی رہے ہیں جہاں معلومات کی فراوانی ہے لیکن بصیرت کی کمی ہے، جہاں آوازیں بہت ہیں لیکن تحقیق کم ہے، جہاں جذبات زیادہ ہیں مگر تدبر کم۔ ایسے ماحول میں قرآن کی دعوتِ فکر اور شعور ایک نئی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔

دین بحیثیت تمدنی و معاشی نظام

فکرِ پرویز کا ایک اور نمایاں پہلو دین کو ایک اجتماعی اور تمدنی نظام کے طور پر دیکھنا تھا۔ ان کے نزدیک قرآن تعویذ نہیں، دستور ہے اور دین وراثت نہیں ذمہ داری ہے۔ دین محض چند رسومات یا انفرادی نجات کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا نظامِ حیات ہے جو عدل، مساوات، معاشی تحفظ اور انسانی عزت کو یقینی بناتا ہے۔

اسی تصور کے تحت انہوں نے قرآن کی معاشی تعلیمات پر غور کیا اور اس بات پر زور دیا کہ وسائل کی گردش اور اجتماعی فلاح کسی بھی قرآنی معاشرے کے بنیادی ستون ہیں۔ یہ نظام نعروں سے نہیں بلکہ قانون ''العفو'' کے تحت اپنے اخراجات کو سادہ اور فطری بنا کر اپنے وسائل اور کیش فلو آپس میں اس طرح گردش میں رکھنے سے شروع ہوتا ہے کہ معاشرے کا کوئی بھی حصہ معاشی طور پر کمزور نہ رہے۔

فکری رواداری اور اصول اختلاف: (اہل تکفیر کے نام)

آج کے فکری ماحول میں جہاں اختلاف رائے کو دشمنی اور کفر و ایمان کا معرکہ بنا دیا جاتا ہے، وہاں علامہ پرویز علیہ الرحمہ کا منہج اور علم کی اخلاقیات ہمیں ایک بالکل مختلف اور مصفی راستہ دکھاتی ہیں۔ ہمیں یہ اصول اپنانا ہوگا کہ ہم عقیدے کی غلطی کو غلطی کہیں گے، گمراہی کو گمراہی کہیں گے، مگر کسی کلمہ گو کے ایمان کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان صرف الفاظ سن سکتا ہے، دلوں کا حال نہیں۔

اگر ہم یہ طے کر لیں کہ چاہے اختلاف کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، ہم کسی کلمہ گو کے ایمان پر آخری مہر لگانے کی جسارت نہیں کریں گے، تو یہی علم کی امانت ہے، یہی دین کی اخلاقیات ہے، اور یہی ایمان کی شرافت ہے۔

حاصل کلام: 9 جولائی اور حال کا عمل

آج جب ہم 9 جولائی کو یاد کرتے ہیں تو اصل اہمیت کسی شخصیت کی نہیں بلکہ ان اصولوں کی ہے جو ہر دور میں زندہ رہتے ہیں۔ شخصیتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں، لیکن سوال باقی رہتے ہیں۔ اور غلام احمد پرویز کا چھوڑا ہوا سب سے بڑا سوال شاید یہی ہے:

کیا مسلمان، خصوصاً ہماری آنے والی نسلیں، قرآن کو براہ راست سمجھنے، اس میں تدبر کرنے اور اپنے فکری و تمدنی مسائل کا حل اس کی روشنی میں تلاش کرنے کے لیے تیار ہیں؟

اس سوال کا جواب ہر نسل کو خود دینا ہوگا۔ 9 جولائی کا یہ دن تقویم کی کوئی عارضی یا روایتی تاریخ نہیں ہے، بلکہ یہ زمین میں بوئے گئے اسی شعور کے بیج کی یاد دہانی ہے جس کی آبیاری کا مستقل تقاضا ہمارے چوبیس گھنٹوں کے زندہ عمل سے جڑا ہوا ہے۔ بیج زمین کی آغوش میں اپنا کام کر رہا ہے؛ اب بس کائنات کے ابدی قوانین پر کامل اعتماد کے ساتھ اس خاموش انقلاب کو لائیو کرنے کا سفر باقی ہے۔

جولائی 9 کی اصل یاد یہی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

نجمہ بہت ذہین بچی تھی۔ جو بات ایک بار سن لیتی وہ جیسے ہمیشہ کے لیے اسے یاد ہو جاتی۔ جس سے ایک بار مل لیتی، اس کا چہرہ اور نام کبھی نہ بھولتی۔ پڑھنے میں بھی وہ بہت تیز تھی۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ اوّل آتی۔ اسے اپنی کتابوں کے اکثر سبق اور نظمیں زبانی یاد ہوگئی تھیں۔ نجمہ کو اپنے حافظہ پر بڑا غرور ہوگیا۔ اس نے محنت سے اپنی کتابیں پڑھنی چھوڑ دیں۔ ہر وقت قصہ کہانی کی کتابیں اور رسالے پڑھتی رہتی۔

آخر امتحان سر پر آ گیا۔ اب نجمہ تھی اور کورس کی ڈھیر ساری کتابیں۔ تاریخ، جغرافیہ، انگریزی، اردو، حساب، جنرل سائنس وغیرہ۔ نجمہ نے سب کتابیں یاد کرنے کی کوشش کی مگر آٹھویں جماعت کا کورس اتنا آسان تو ہوتا نہیں کہ دس بارہ دن میں پڑھ کر کوئی پاس ہو جائے۔

امتحان ہوا۔ نجمہ کے پرچے اچھے نہ ہوئے۔ چند دن کے بعد نتیجہ نکل آیا اور ہمیشہ اوّل آنے والی نجمہ فیل ہوگئی۔ تمام خاندان کو بہت حیرانی ہوئی کہ آخر یہ کیسے ہوگیا؟ مگر ہونے والی بات تو ہو چکی تھی۔

نجمہ بہت اداس اداس رہنے لگی۔ وہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہ نکلتی۔ آخر اس کی امی اور ابّو نے اسے بہت سمجھایا: ’’غم نہ کرو۔ صبر کرو۔ انشاء اللہ اگلے سال پاس ہو جاؤ گی۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔‘‘

نجمہ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر صبر کرنے سے کوئی پاس کیسے ہو سکتا ہے؟ صبر کرنے سے دوسرے کام کیسے ہو سکتے ہیں؟ نجمہ کے ذہن میں بہت پریشانی پیدا ہوگئی۔ ایسی پریشانی جو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔

ایک دن نجمہ کے ماموں کراچی سے لاہور آئے۔ نجمہ کو اپنے ماموں سے بہت پیار تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور اس خوشی میں اپنے فیل ہونے کا غم بھول گئی۔ ماموں نے نجمہ کو لاہور کی خوب سیر کروائی۔ جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد، شالامار باغ، باغ جناح، چڑیا گھر، مینارِ پاکستان، جلو پارک، ریس کورس پارک، گلشنِ اقبال پارک، قائداعظم لائبریری اور بھی کئی جگہوں پر خوب گھومے پھرے۔ جب اتوار آیا تو انہوں نے صبح ہی صبح نجمہ سے کہا:

’’بیٹی آٹھ بجے تک تیار ہو جانا۔ آج ہم درسِ قرآن سننے چلیں گے۔ قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اس کتاب کی اچھی اچھی اور پیاری پیاری باتیں سمجھ کر اور ان پر عمل کر کے ہم بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔ یہی ہماری بڑائی کا واحد راستہ ہے۔ آج مسلمان دنیا کی دوسری قوموں سے کتنا پیچھے رہ گئے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اب وہ قرآن مجید سے اپنی

زندگی کے لئے روشنی حاصل نہیں کرتے۔''

نجمہ اندر جا کر عورتوں اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ جو صاحبِ درس قرآن دیتے ہیں۔ اُنہیں یہ سب لوگ ''بابا جی'' کہتے ہیں۔ دس بجے درس قرآن شروع ہوا۔ بابا جی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر اپنی تقریر شروع کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی نجمہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بابا جی تو ''صبر'' کے بارے ہی میں تقریر کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ قرآن مجید کی روشنی میں صبر کسے کہتے ہیں۔

بابا جی نے بتایا:

''عربی زبان میں صبر کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنا کام مکمل کرنے کے لئے بھرپور محنت کرتا رہے۔ لگاتار کوشش اور اپنے مقصد پر مضبوطی سے ڈٹ جانے کو صبر کہتے ہیں۔ اسی لیے پہاڑ کو ''الصبیر'' کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جما کھڑا رہتا ہے۔''

نجمہ بہت پڑھی لکھی تو نہ تھی کہ بابا جی کی تمام باتیں اس کی سمجھ میں آجاتیں مگر اس نے بڑے غور سے تقریر سنی۔ صبر کے سچے اور اصلی معنی اس کی سمجھ میں آ گئے۔

بابا جی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال دے کر بتایا کہ وہ تھے سچے صبر والے جو اللہ کے راستے پر ڈٹ کر آگے بڑھتے رہے۔ مشکلیں آئیں، مخالفین نے جنگیں کیں مگر نہ تو ان لوگوں میں کمزوری آئی اور نہ ان کے قدم سست پڑے۔

جب تقریر ختم ہوئی تو جیسے نجمہ کے ذہن کی الجھن دور ہوگئی اور یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

گھر واپس جاتے ہوئے نجمہ نے اپنے ماموں سے کہا:

''ماموں جی! اب میں بہت محنت سے پڑھوں گی۔ یہی تو صبر ہے مگر زیادہ تر لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ جب کسی آدمی کے غلط کاموں کا بُرا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس سے کہتے ہیں صبر کرو۔ آخر ایسے صبر سے کیا ہوسکتا ہے۔ توبہ توبہ''۔

ماموں کہنے لگے:

''بیٹی! مسلمان کی تباہی کی وجہ یہی تو ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ تو باقی رہ گئے ہیں مگر ان کے معنی بدل گئے ہیں۔ میری بیٹی! تم محنت سے پڑھو اور قرآن مجید کو اپنا ساتھی بنالو۔ یوں تمہاری زندگی بھی سنور جائے گی اور تمہارے آس پاس والوں کی بھی۔''

ضرورتِ رشتہ

ایک باکردار، دیندار اور فکرِ قرآن سے وابستہ قرآنی بہن عمر 50 سال کے لیے ایک نیک سیرت، بااخلاق اور فکرِ قرآنی کے حامل مرد کا رشتہ مطلوب ہے۔

عمر، ذات پات یا معاشی حیثیت کی کوئی خاص قید نہیں، اصل ترجیح دین داری، اچھا کردار اور قرآنی شعور ہے۔

مزید احوال و کوائف رابطہ کرنے پر مہیا کیے جائیں گے۔

رابطہ برائے معلومات (واٹس ایپ): 03079431865
03020424087

حکیم محمد سعید (مرحوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی حکومت

اس کرۂ ارض پر مختلف اور متعدد اقوام و ملل آباد ہیں۔ کب سے آباد ہیں، یہ ہم میں سے کوئی صحیح نہیں جانتا۔ کب تک آباد و قائم رہیں گی؟ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فیصلہ غیب کیا ہے، ان اقوام و ملل کی بہرحال ایک تاریخ ہے۔ یہ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اگر یہ دیا جائے تو بجا ہوگا اور درست، کہ اقوام و ملل نے اپنے ہر دور میں اور پورے تسلسل کے ساتھ اپنی آزادی اور اپنی حریت فکر کے لیے جو جدوجہد کی ہے ہر انسانی تاریخ اس کی ایک داستان مسلسل ہے، انسانی تاریخ کے آپ کسی بھی دور میں چلے جائیے۔ یہ دور غاروں کا دور ہو یا جھونپڑیوں یا محلات کا، کاغذ کا دور ہو یا دھاتوں یا پتھروں کا دور ہو آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں انسانی تمدن کے انداز بدلے ہیں، ثقافت کے نقشے نئے نئے قائم ہوئے ہیں۔ افکار و حوادث کے نئے رنگ قائم ہوئے ہیں، خیالات میں انقلابات آئے ہیں۔ اس کے باوجود تاریخ انسانی کے ہر دور میں ایک قدر مشترک ہر قوم و ملت میں رہی ہے اور وہ یہ کہ تضادات و تباین کے باوجود اور اختلاف و تنوع کے باوصف انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ اور ہر حال میں اور ہمہ وقت آزادی کی حمد و ستائش کی ہے اور اپنی آزادی کو قائم اور باقی رکھنے کی جہد مسلسل اور سعی کامل کی ہے۔ اس جہد مسلسل اور سعی کامل کا نام تاریخ انسانی ہے۔

ہندوستان میں جب تحریک آزادی نے جنم لیا اور برطانوی استعمار کے خلاف اہل وطن جب صف آراء ہوئے تو اس وقت تحریک آزادی کا مفہوم و منتہا اور مقصود یہ تھا کہ برطانوی استعمار اور انگریز کی طاقت کو پاش پاش کر دیا جائے اور اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ اس تحریک میں برصغیر کی تمام قومیں شریک تھیں۔ اس موقع پر شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی رہنمائی قرآن کی روشنی میں کی۔ علامہ اقبالؒ نے مغرب کے جمہوری نظام کو اسلام کے خلاف سازش قرار دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مغرب کا جمہوری نظام استبداد ملوکیت کی ایک نقاب پوش شکل ہے، اس میں نوعِ انسانی کبھی آزادی سے ہم کنار نہیں ہو

سکتی۔ دوسرے یہ کہ یہ مغربی اندازِ فکر اور مغربی نظامِ جمہوریت اسلام کی ضد ہے اس لیے اس میں انسان کو وہ آزادی میسر نہیں آسکتی کہ جو اسے اسلام عطا کرتا ہے۔اس مغربی نظام جمہوریت نے اور اشتراکیت نے یہ آوازہ بلند کیا کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں' انہی کو حق حکومت پہنچتا ہے۔مگر قرآن کریم اس مفروضے کو باطل قرار دیتا ہے۔ قرآن کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ اس صورت حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حق حکومت اگر کسی انسان کو حاصل نہیں ہے تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے؟ قرآن انسانوں کی تمدنی زندگی کے لیے نظام حکومت ضروری قرار دیتا ہے' لیکن اس کا کہنا یہ ہے کہ حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط (6:57)

ترجمہ: وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26)

اس اساس پر اور اس بناء پر۔

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ط (12:40)

اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (12:40)

''یہی محکم نظام حیات ہے' لیکن اکثر لوگ' اس بات کو نہیں سمجھتے۔''

اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں کاٹ دی ہیں اور آزادی کا سانس لے لیا ہے۔

قرآن واضح الفاظ میں اور ذرہ برابر کسی ابہام کے بغیر کہتا ہے کہ حکومت اللہ کی کتاب یعنی قرآن حکیم کے ذریعہ سے قائم ہو گی جس میں کسی انسان کو دخل نہ ہو گا' کیوں کہ اللہ اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ اس حقیقت کی توضیح کے لیے خود زبان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (6:114)

یعنی۔''کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور حاکم کی طلب وجستجو کرو' حال آنکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے کہ جو مفصل ہے۔''

برصغیر کے مسلمان' تحریک آزادی میں شریک ہوئے اور اس جدوجہد آزادی میں اس نظریہ ء اساس کے ساتھ مستعد و متحرک ہوئے کہ وہ پاکستان قائم کریں گے جہاں قرآن کی حکومت قائم ہو گی اور اللہ کا قانون نافذ ہو گا۔ ان کے پاس جذبہ ء صادق تھا' ان کا ایمان کامل تھا اور یقین محکم۔ دنیا کی ہر بڑی طاقت مسلمانان برصغیر کے جوش ایمانی کے سامنے زیر ہو گئی اور غیر ملکی استعمار نے ہار مان لی۔

برادرانِ وطن! یہ عجیب اور حیرت انگیز حقیقت ہے اور کرشمہ ءالٰہی ہے کہ پاکستان ٹھیک اس دن عالم وجود میں آیا اور منصہ ءشہود پر جلوہ گر ہوا کہ 27 / رمضان المبارک تھی' یوم نزول قرآن تھا! بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا' یہ نظام الٰہی تھا کہ پاکستان ایسے دن قائم ہوا کہ جو تمام عالم اسلام کے نزدیک مبارک و متبرک ہے اور جس کی عظمت و تقدس پر سارا عالم اسلام متفق و متحد ہے۔ درحقیقت یہ بڑا اہم فیصلہ تھا' کیوں کہ منشائے الٰہی یہی تھا کہ پاکستان قائم ہو اور اس میں حکومت قرآن قائم ہو۔ 27 / رمضان' یوم نزول قرآن ہے۔ اس یوم مبارک کے بارے میں قولِ فیصل ہے اور حرف آخر کہ اسلام اور عالم اسلام کے لیے یہ تاریخ ساز دن ہے۔ اس دن قرآن کریم نازل ہوا اور اس لیے نازل ہوا کہ اس کرہ ارض کی ہر تاریکی کو روشنی سے منور کردے اور ہر باطل کو مٹا کر حق کو قائم کردے اور اس کرۂ ارض پر اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو۔

قرآن کریم میں اللہ کے سوا ہر طاقت کو طاغوت کہا گیا ہے' اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''جو اللہ پر ایمان لایا اور اس نے طاغوت سے کفر برتا تو اس نے ایسا محکم سررشتہ تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔''

(2:256)

اس ارشاد باری تعالیٰ کی روشنی میں ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ وہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب اللہ پر ایمان لائے' لیکن عملاً ان کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مسائل و معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں حال آنکہ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ طاغوت سے کفر برتیں۔ ایسے لوگ صحیح راہ پر نہیں ہیں۔ وہ ایک سانس میں اللہ کے قانون کی بات کرتے ہیں' مگر دوسرے میں اس کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا قلب و ایمان متزلزل ہے' حال آنکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کلمات (قوانین الٰہی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہوگئے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔ یوم آزادی مناتے وقت ہم کو ایک تاریخ ساز فیصلہ کرنا ہے کہ

☆ پاکستان میں اقتدار اعلیٰ قرآن مجید و فرقان حمید کو حاصل ہوگا۔

☆ مملکت پاکستان کا فریضہ قرآنی احکام و قوانین کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

☆ پاکستان کا ہر فرد احکام قرآن کے مطابق زندگیوں کو ڈھالے گا اور پیروی اور اتباع سنت رسولؐ کرے گا۔

☆ اور ایک ایسا قرآنی نظام شوریٰ قائم کیا جائے گا کہ جو بازی گری سیاست اور مذہبی فرقہ بندیوں سے ماوراء ہوگا۔

(بشکریہ ہمدرد صحت' اگست 1998ء)

Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 3

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is October 5, 1982 and our lecture starts with Surah Al-Najm (النجم) verse (53:1).

Summary of the last two lectures

My dear friends, I presented details of the tradition that is called Isra and Mi'raj. For the first part, verse (17:1) is presented in support of our Prophet's journey on Buraq from Masjid Al-Haram to Masjid Al-Aqsa. And Surah Al-Najm is presented in support of the second part of the event – going to the heavens and meeting Allah. We saw that the first part is against the facts; and the second part is against the concept of Allah as presented by the Quran, which says that Allah is there wherever you are; that He is closer to you than your jugular vein. So, one does not have to go to a particular place to meet Him.

Anyway, let's start Surah Al-Najm. In a nutshell this Surah explains the proper position of نبی (Nabi) and its high status. It provides the true place of Muhammad (PBUH) as the recipient of Allah's وحی (Wa'hi - Revelation). Although the entire Quran is unique in its style and presentation, but some Surahs reach the pinnacle in their loftiness and elegance. And Surah Al-Najm is on top of the list of such Surahs, in my opinion.

Human mind cannot comprehend the source of وحی (Wa'hi - Revelation)

My dear friends, although every word of the Quran is Quran; that every word of the Quran has within it deep meaning – but its source is beyond the material universe; that we cannot come up with a term for it, or even comprehend or imagine its source. This part of how the revelation originated and how it came down to the Prophet (PBUH) is beyond human grasp. But, nonetheless, its language and its meaning is connected with this world. So, we can very well imagine how deeply concentrated its meaning would be. This Surah reflects that characteristic. And its next part – which also consists of one or two words and is also deeply concentrated in its meaning – is to establish the divine system in the world based on this revelation. So, we can say that the first part which involves the receiving of the revelation is **نبوت** (*Nabuwwat*); and the second part, to establish a system of life in the human world based on the revelation, is the **رسالت** (*Risaalat*). Although every prophet received a book, but our Prophet (PBUH) was at the pinnacle of **نبوت** (*Nabuwwat*) because he was the

recipient of the final Book of Allah. That is why I titled my book on the biography of the Prophet (PBUH) as the "Pinnacle of Humanity." And that is why I titled a booklet, the "High Status of Muhammad (PBUH)" dealing with explanation of Surah Al-Najm. This Surah has the basic characteristics of both the **نبوت** (*Nabuwwat*) and the **رسالت** (*Risaalat*).

Quran provides fundamental attributes of true knowledge

A movement called "humanism" started in Europe but couldn't get very far. Its signs are still there though. The idea behind this movement was that humans need religion but that religion should not be based on revelation from God. Julian Huxley was a prominent figure in this movement and the title of his book is "Religion without Revelation." He claimed that he was in search of such a manmade religion, and he wanted that this should be presented in such a language which "would be simple enough to appeal to the generality of men, but at the same time deep and rich enough to satisfy the most complex mind" (NY Times, 8.22.1952). The Quran has both these qualities. There were very few among Arabs who could read and write 1400 years ago. They were the most backward people in the world at the time. These were the first addressees of the Quran. To present the realities of the Quran so that even they could understand, was a challenging and difficult task. The Quran is a guidance for humanity until eternity. So, no matter how far human knowledge advances, the Quran will continue to lead that knowledge, and will continue to guide humankind. So, think about it my friends: how unique, unparalleled, and all-encompassing attributes this Book should have! This is the style of the Quran. Now, look how the Quran explains these nomadic desert Bedouins that this Book will serve them as their guidance – that it will not change; that it will not deceive; that it will not desert them in the middle of the way.

Arabs generally travelled in the night because of the extreme desert heat in the day. There were no roads nor lights nor landmarks nor towns in the desert. Oases were few and far between where nomadic Bedouins used to stay for few days and move on to the next one. Imagine it is dark night. Sand dunes in deserts will be here today and gone tomorrow. So, they cannot serve as landmarks. Bushes could not serve as landmarks because the desert storms would cover them with sands. These were the conditions under which these Bedouins used to travel in the night. So, they were asked: what provided you guidance to travel in the night under these harsh and uncertain conditions? The answer: Stars. Did the stars deceive you ever? No. Did any star which was at one place one night and suddenly disappeared the other night? No. So, these heavenly stars provide you complete and permanent guidance in your journey at night and do not deceive you? Yes, that is the case. Then, don't you think you also need heavenly, complete, and permanent guidance that will guide you in your life's journey as well? This is a perfect and clear cut way to explain to these illiterate Bedouin Arabs about the divine guidance that will guide them in their life

journey as well – that will never deceive them; nor disappear nor change.
So, this is what the first verse of Surah Al-Najm says: وَالنَّجْمِ إِذَا ;مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ هَوَىٰ (53:1-2) – These people wonder about to what extent Allah's وحی (Wa'hi - Revelation), which claims to guide them, is dependable? They are afraid that at some time it may either mislead them or leave them in the lurch. Ask them: where did they get their guidance from, when they travel at night in the desert, where they do not have any fixed sign or clear path to guide them. There you determine your course after seeing the position of stars. So what does this experience tell you? Is that guidance not dependable? Do the stars deceive you by changing their positions? Do they not always provide you the same guidance? Have they ever left you confused? So whatever opinion you have with regard to the stars, it should be exactly the same in respect of Allah's وحی (Wa'hi -Revelation). The Messenger gets the وحی (Wa'hi - Revelation) from the same source from where stars get their guidance to travel on a set course (6:98; 56:75). Therefore, the star which appears at a fixed point and which travels across a set course and sets at a particular point (always following the same course and pattern), is a witness to the fact that, your companion (who has been commanded to guide you on the right path of life) is neither wandering in search of the right course, nor has he gone astray after finding it. He knows his destination and the way that leads to it.
As we have mentioned many times before the letter و is used in Arabic for evidence, and Najm means star. The word هَوَىٰ is a very comprehensive word. It includes in its meaning all its three phases: its rise at a certain place; its complete path that it travels through; and then a fixed place that it sets.

Quran's introduction of the Prophet (PBUH)

Arabs were extremely proud of their poetry and their language. They used to call others 'Ajam (dumb). But they were awe-struck by the presentation and the style of the Quran. They didn't know what to call it – poetry, prose, or something else. The verse (53:1) has just two words. The word هَوَىٰ captures the rise, the entire movement, and the setting of star. And the Quran introduces the Prophet (PBUH) to them as their صاحب (Sahib), as their companion and friend – not their Imam or leader. The Quran tells them: the Prophet (PBUH) to you is like the members of your caravan. غَوَىٰ means one who has lost one's way; and ضَلَّ means one who is trying to find one's way. So, the Quran is saying that your companion has not lost his way. He knows his way and his destination, just as the star does. Both get their guidance from the same source. The person who receives revelation clearly knows his way because it is not the result of his own effort and thoughts. If one has to find one's own way, then one goes through a trail-and-error process. But a messenger receives revelation from Allah. There is no trace in it of his own thoughts. What the messenger conveys to you is purely objective truth that comes from the Almighty creator of the Universe, Allah. So, the Quran proclaims: وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (53:3) – Whatever he tells you in his

capacity as a Messenger, he does not say it on his own. He only narrates the وحی (Wa'hi - Revelation) revealed to him from the Almighty. The Quran contains Divine revelation and the feelings or personal opinion of the Messenger have no share in it. Human emotions and opinions are a result of personality and reflect a person's exposure in society. However, the وحی (Wa'hi - Revelation) that one gets from outside source is objective truth. It is permanent, unchangeable, and impervious to human emotions and thoughts.

Human intellect makes decision based on the material and data it has at certain time. After a while when data or material change, it makes a different decision. In fact, human thoughts keep changing all the time. So, what the Messenger presents to you is not the product of his own thoughts. It is Allah's revelation: إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (53:4) – Whatever he tells you in his capacity as a Messenger, he does not say it on his own. He only narrates the وحی (Wa'hi - Revelation) revealed to him from the Almighty. Quran contains Divine revelation and the feelings or personal opinion of the Messenger have no share in it.

The Quran says that وحی (Wa'hi - Revelation) was sent to stars, to heavens and earth, to honeybee. So, the وحی (Wa'hi - Revelation) sent to the Messenger will definitely guide you to the final divine goal as promised. The Messenger will practically implement the divine plan and the results will provide the proof. So: قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (6:135) – O Messenger, tell your people: "You may do whatever you choose; I will not interfere. On the other hand, do not interfere in My program. The results will soon show to whom success will eventually belong. Allah's law is that tyrants can never prosper."

This is the pragmatic test for any program: you work on your program and I will work on my program. The result will show who is beneficial to humanity. End of the matter! But this is not the case in the world of religion. Just keep following what you are told by the religious leaders. When people ask them why the promised results are not showing up, people are told that results will come in the hereafter. That is, take the medicine here but you will get better after you die! However, this is Deen which provide pragmatic test *here* in *this* world. It says to its opponents to provide proof: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (2:111) – Provide the proof if you are truthful.

My dear friends, this is distinctive characteristic of Deen compared to religion. This is how the Quran explained the divine guidance to the illiterate Bedouins by pragmatic example of stars who used them for their guidance for traveling in the desert at night. Now, let us see how the Quran could also provide guidance to scientist and intellectuals. The Quran says that all things in the Universe are tightly interconnected and are subject to the Laws of Nature; and that humans have been given the power to conquer the forces of nature and make use of them. Objects in the Universe are so tightly interconnected with each other that James Jean says that if I move my figure then it has effect on stars inside the galaxies. So, on one side, the

illiterate desert Bedouins were able to understand and, on the side, scientists like James Jean is also able to understand from the same statement that the Quran presents. This is the reason Maurice Buccaille was in awe when explaining such verses of the Quran related to Nature and asked all the scientists of the world to ponder on this fact: that how could a human being tell these things 1400 years ago when modern science has been able to discover only now! So, the author of the Book, the Quran, must be the author of the book of Universe.

My dear friends, the claims of the Quran are not based on creed. We, Muslims, have not done our job to understand the Quran from this point of view, what to say of providing irrefutable evidence of Quran's claim to the world. Therefore, from the stars the Quran provides practical evidence of its message to Bedouins as well as to top scientists. So, what the Messenger presents to you is not the product of his own thoughts. It is Allah's revelation: إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (53:4). I presented many verses in previous lectures about this. There is no need to repeat here. Here are some references regarding how stars guide you (6:97, 56:75, 81:15). Next the Quran says regarding the revelation that the Prophet (PBUH) receives: عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ (53:5) – He gets it from One, Who is Universally Mighty and Powerful. You can visualize His Power and might from the countless stars and galaxies that are traveling in their determined paths, bound by His Laws. Similarly, the laws that have been revealed to humankind through this وحی (Wa'hi - Revelation) are bound to produce their results, without any deviation.

The fundamental differences in thinking and in program between Deen and religion

My dear friends, please ponder what a great reality the Quran has described in (53:5). Sermons exhorting morality and ethics have continued in the world. Every religion preaches these things. Deen does not preach and sermonize. Deen establishes its system in the world. It confronts the forces of falsehood head on. It fights and overpowers them. Therefore, to establish Deen power is needed. This was the fight between religion and Deen that we went through during Pakistan movement. Proponents of religion were saying that there is no need to have a separate country for Islam; that we are free to practice Islam by remaining in India. So, why demand a separate country? Yes, ok, for religion there is no need to have a separate state. But to establish Deen requires not only a separate state but also power to maintain control of the state. After receiving the teaching (عَلَّمَهُ) of revelation, strong power (شَدِيدُ الْقُوَىٰ) is required to establish it. As Allama Iqbal says: If there is no power, then divine rule cannot be established – the work of Moses becomes worthless.

System of sustenance must adapt to changing conditions

Nothing remains the same forever. Everything in nature changes continuously. Bedouin Arabs didn't travel the same path always. They travelled to different destinations depending on changing conditions. The condition and requirements of

humankind keeps changing all the time at the individual level as well as at the collective level. A child's nutritional requirement keeps changing from the moment he is born. Nourishment progressively adapts as the fetus develops inside the mother's womb. After birth the mother's milk automatically adjusts to nutritional requirement of the baby as he grows. This is the system of divine sustenance. This attribute of Allah is called Rahim – One who provides nourishment that adapts progressively according to changing conditions.

Character attributes required to implement Allah's system of sustenance

My dear friends, if you look at the entire life of an individual from birth to death then you will notice that requirement for his physical, mental, and psychological sustenance and development keep changing throughout his life. An individual's life goes through many phases through this life. Allah does not give this sustenance all at once. He does not say that take this sustenance, which is for your entire life. If He has all the power and authority, if he is شَدِیۡدُ الۡقُوٰی then He has also the control over different phases humans go through throughout life: ذُوۡ مِرَّۃٍ فَاسۡتَوٰی (53:6) – Not only does the Almighty possess unlimited powers, but He is also aware of the various ups and downs of life. He is therefore capable of providing comprehensive guidance that covers all aspects of one's individual and collective life. It is obvious that the person, the Messenger, who has to receive وحی (Wa'hi - Revelation) should be an embodiment of virtue and wisdom. Hence the Messenger's personality developed with complete poise and his character attained perfect purity to accomplish the task of establishing the universal system of sustenance.

As I mentioned, there is a world of meaning in every word of the Quran. One who has only power knows only power. But. along with having power and authority, He also has the responsibility of providing sustenance. So, He must also know and have full control over the requirement of providing sustenance in every phase and every period of life. This is the case with the One who provides the وحی (Wa'hi - Revelation). Then comes the responsibility of the recipient of the وحی (Wa'hi - Revelation), the Prophet (PBUH). After receiving the revelation, he must have the power to establish the universal divine system of sustenance; and to practically provide and carry out that responsibility of messenger-hood through all the phases of life of the community.

The messenger serves as a perfect role model in the human world

This heavy responsibility rests now on the shoulders of the Messenger (PBUH) to implement this universal system of sustenance. What kind of attributes he should possess to fulfil this responsibility? There should be power; there should be knowledge; there should be sustenance; there should be progress and development. The Messenger should be aware of the different phases and consequent requirements of life of the community. He should have physical power and authority (*Aziz*); as wells as the control over progress and development and sustenance (*Rahim*).

These are the two attributes that the messenger should possess in his character to establish and to run the divine system of universal sustenance in the human world. There should be optimal balance between these opposite attributes in the messenger's character in order to take the human society on the path of holistic progress and human development. Otherwise, there will be chaos in the society. If the power dominates in his personality, then he will become Genghis. If there is no power or it shrinks, then he will become preacher and won't be able to establish the system of Deen. It is essential therefore that these two opposite attributes be in proper proportion in his personality.

Psychology in the modern age

This is called "balanced personality" in terms of modern psychology. What is called psychological disease is really an imbalance of personality attributes. Fourteen hundred years ago the Quran called it: فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ (2:10) – they have disease of the mind. And the Quran provides cure for it: شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ (10:57). Allah Akbar!

My dear friends, nobody could understand these terms what the Quran has mentioned those days. What are these diseases of the mind? Modern psychologists have coined different terms for these diseases. One of the terms they have coined is called "psyche." This is different from what the Quran calls the diseases of the قُلُوبِ. I don't have time to delve into details now. But let me tell you that in a nutshell these diseases arise in the subconscious mind. Unfulfilled desires, crushed wishes, weight of uncommitted sins are hidden in the subconscious mind; and these prick the subconscious mind like a thorn. Psychologists and psychiatrists say that when the balance of different abilities gets disturbed in the mind then it expresses itself as a disease. The cure they prescribe is to restore the balance. So, healthy mind is the one which is able to achieve balance within all the contradictory abilities and powers within the mind.

The Prophet (PBUH) was at the top of the perfect balanced personality

My dear friends, the definition of beauty is having perfect proportion. In an otherwise perfectly beautiful face if there is a minor flaw in one eye compared to the other eye then its entire beauty is ruined. Similarly, if there is minor flaw – e.g., being hot-tempered – in an otherwise balanced personality, the that personality becomes unbalanced and therefore sick. The Prophet (PBUH) was at the pinnacle, having the perfect balanced personality. The Quran says about the Prophet (PBUH): ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ (53:6) – The Messenger is the perfect embodiment of virtue and wisdom. He has the most balanced personality with complete poise and with perfect purity of character required to accomplish the task of establishing the universal system of sustenance.

The world is awe-struck by how the Prophet (PBUH) created the unique and the greatest revolution the world has seen. This is called فَاسْتَوَىٰ (53:6). The word اسْتَوَىٰ (Istawa) means to have perfect balance. Without balance one cannot stand firmly;

without balance a nation cannot move forward because it cannot stand firmly on its feet. If one of the feet of a chair is missing, then one will fall if one sits on it.

My dear friends, the model is: Achieving balance in multitude of contradictory potentials that Allah has given humans and taking it to the pinnacle of perfection is اسْتَوٰى (Istawa). The Prophet's (PBUH) perfect balanced personality that reached the highest pinnacle of character is summed by the Quran in this one word – فَاسْتَوٰى (53:6) and is the best role model for humanity.

The world of Sufism

My dear friends, time is running out fast. The question is: if one has achieved the balanced personality; one has achieved proper proportion in one's abilities; one has all the qualities – but after all this accomplishment if one is sitting aloof cut off from humanity's issues then what is the use. In the words of Ghalib: If one does not cure my pain and suffering then one may be the son of Mary, so what? My dear friends, this is the difference between Sufism and messenger-hood. I have gone through the valleys of Sufism. The more the Sufis go higher and higher in this valley the more and more they shrink away from the world. They remain more and more absorbed in their own virtual world by renouncing the real world.

My dear friends, what is the use of reaching these heights if one remains detached from this world. The **نبی** (*Nabi*), in fact, reaches such a pinnacle of height that he receives revelation from Allah. And the Sufi also claims to receive what he calls **کشف** "*Kashf*" and **الہام** "*Ilham*." The **نبی** (*Nabi*) reaches the place of unitary experience, which is at the pinnacle of divine knowledge and divine revelation. The divine knowledge directly enters the breast of the **نبی** (*Nabi*). This is pure, objective, and definite knowledge that the **نبی** (*Nabi*) receives from Allah. If he also goes into solitude and remains absorbed in his own virtual world like the Sufi does – then what is the use of that knowledge to the humankind facing challenges and problems of the real world. A **نبی** (*Nabi*) descends from this pinnacle of height and returns to the real world. Please listen to just two words my friends, and remain ecstatic until the next lecture. The Quran says that after reaching such a height he returns to the level of this world. Did your mind find any metaphor to describe this situation? Well, it is impossible to come up with a perfect metaphor to describe this whole scenario. You know that the place where the sky and the earth seem to meet is called the افق (*Ufaq*) or horizon. This is the perfect metaphor to explain that the heavenly divine revelation which the **نبی** (*Nabi*) receives from Allah, he then brings it down to the earthly level: وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (53:7) – When he received the وحی (Wa'hi – Revelation) he reached the pinnacle of knowledge (that is beyond human intellect or wisdom) and returned to human level. Hali has put it in a beautiful way:

After returning from Hira he came to the people;
And brought a prescription of humanity's ailment!

Think about it my friends! I have been thinking in the Quran for a long time. I have been explaining and writing about its teaching for quite some time. But I could not come up with such a perfect metaphor to explain this concept in a such beautiful perceptible way that a **نبی** (*Nabi*) after reaching the pinnacle of divine knowledge, he returns to tackle the problems of the human world.

Allama Iqbal explains the difference in position of Sufi and نبی (*Nabi*)

Allama has explained the difference in the experience of Sufi and the **نبی** (*Nabi*) in his book entitled, "The Reconstruction of Religious Thought in Islam." It is a difficult book to read but I advise you to read if Allah has given you the abilities. He quotes the famous saying of a Sufi (Abdul Quddus Gangohi) in this book. Iqbal writes:

"Muhammad of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned." These are the words of a great Muslim saint, 'Abd al-Quddūs of Gangoh. In the whole range of Sufi literature it will be probably difficult to find words which, in a single sentence, disclose such an acute perception of the psychological difference between the prophetic and the mystic types of consciousness. The mystic does not wish to return from the repose of `unitary experience'; and even when he does return, as he must, his return does not mean much for mankind at large. The prophet's return is creative. He returns to insert himself into the sweep of time with a view to control the forces of history, and thereby to create a fresh world of ideals. For the mystic the repose of `unitary experience' is something final; for the prophet it is the awakening, within him, of world-shaking psychological forces, calculated to completely transform the human world. The desire to see his religious experience transformed into a living world-force is supreme in the prophet. Thus his return amounts to a kind of pragmatic test of the value of his religious experience. In its creative act the prophet's will judges both itself and the world of concrete fact in which it endeavours to objectify itself. In penetrating the impervious material before him the prophet discovers himself for himself, and unveils himself to the eye of history."

This, my dear friends, is the return of a **نبی** (*Nabi*) after getting the divine revelation from the highest source– he returns to the human world, i.e., to the earth, which he then shapes it step by step and turns into heaven. This is how the divine program is carried out. As the Quran says: يُدَبِّـرُ الْأَمْرَ مِنَ الـسَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ (32:5) – His way of creation is that when, according to His Mashiyyat, He plans a scheme, He initiates it from the lowest level and then (with the cooperation or assistance of various physical elements; and by passing through various stages of an evolutionary process) it slowly and steadily develops to its destination as established by Allah (35:10).

The teaching of revelation: pinnacle of both knowledge and wisdom

The descending from the heaven to the earth is a term the Quran uses for the the وحی (Wa'hi – Revelation). The reality reveals itself and the Quran uses the term **نزول** (meaning coming down from above) for وحی (revelation). The fundamental attribute

of وحی (Wa'hi – Revelation) is its objectivity. So, he was above the horizon: وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ (53:7) – When he received the وحی (Wa'hi – Revelation). Now the Quran says: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ (53:8) – He thus came very close to the absolute realities of the universe and deeply understood the Divine Laws, becoming in unison with them. He returns to face the human issues and delves deep into the heart of humankind's problems. My dear friends, there is big difference in being close to someone and in descending into someone's heart. Joad has written that if a philosopher who has cosmic knowledge and dives deep into human emotion then he is a creative genius. He says both these things are essential for a creative genius. Creative genius creates a new world. The **نبی** (*Nabi*) after receiving the وحی (Wa'hi – Revelation) creates a new world.

My dear friends, a book can be written for each of the words of these two verses: وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ; ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ (53:7-8). So, the **نبـــی** (*Nabi*) after receiving the objective knowledge descends and delves into human issues. But this is not enough. The next verse says: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ (53:9).

I will explain قَابَ قَوْسَيْنِ in the next lecture. Our traditional explanation is the same old same old story based on material space and time: that Allah and the Prophet (PBUH) were facing each other and were getting closer and closer until the distance between them reached the length of two crossbows. Please don't laugh but cry! The entire story of Isra was Mi'raj is based on physical descriptions. It says Allah was physically sitting on His throne. The Prophet (PBUH) physically went there. They physically got closer to each other and they physically talked to each other. All the traditional sermons and hymns highlight these physical stories. I will discuss all these things in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہوسکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوعِ اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہیں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔ (پرویزؔ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

مذہب	دین
8-مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔	دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔
9-مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔	دین' اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے' حرکت وعمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔
10-مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔	دین' اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔
11- مذہب' کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔	دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب وزینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے' جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے(القرآن)۔
12-مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔	دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔
13-مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلاعلم ودلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔	دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل وتدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔
14-مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)' سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز وناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔	دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوعِ انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔
15-مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔	دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.79
ISSUE
07

Monthly TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org

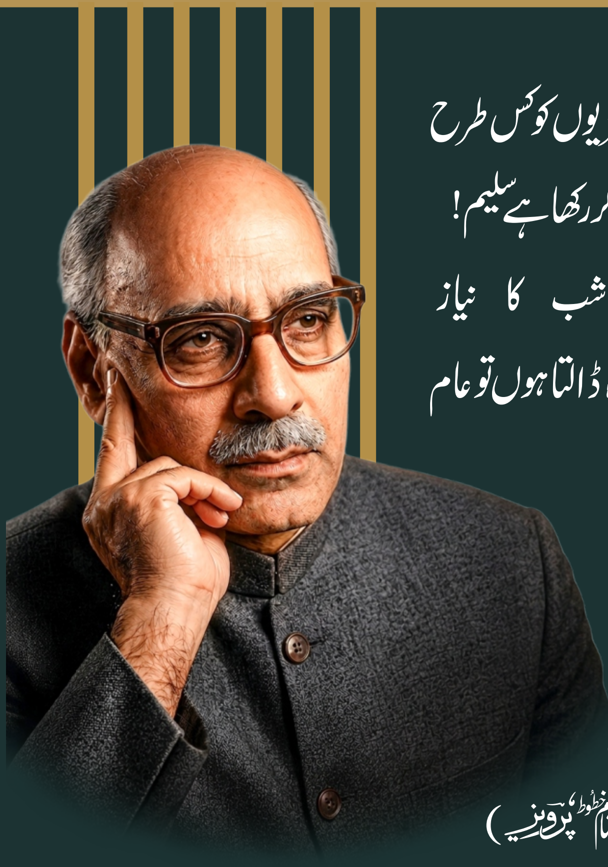

میں سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر درد و کرب کی ان تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنہوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے سلیم!

مرے دیدۂ ترکی بے خوابیاں مرے نالۂ نیم شب کا نیاز

تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ

نہ کہیں لذّتِ کردار نہ افکارِ عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

(سلیمؒ کے نام خطوط، پرویزؒ)